ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلہ تالیفات
نمبر ۱۱

گرچہ فانی شدہ ام ذکر و بیانم باقیست
عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

سوانحات عمر

# ملک العلماء علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی

مع

# تاریخ سیالکوٹ و مشاہیر سیالکوٹ

جسمیں علامۂ زمان فہامۂ دوران مولنا عبد الحکیم "فاضل سیالکوٹی" کی علمی زندگی۔ ان کی یادگاروں اور ان کی نادر تصنیفات کے تذکرہ و تبصرہ اور انکے مشہور واقعہ جنّ اور انکے مشہور عالم دوہم مکتبوں کے ذکر کے علاوہ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور عالمگیر کے عہد زرّین کے علمی کارنامے اور سیالکوٹ کی تاریخ اور اس کے نامور اہل علم مشاہیر کے حالات بھی درج ہیں

(سنہ ۱۳۴۲ھ)
(سنہ ۱۹۲۴ء)

از قلم :-
محمد الدین فوق۔ ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور

کارخانہ پیسہ اخبار کے خادم التعلیم برقی پریس میں چھپکر میاں عبد ... پرنٹر کے اہتمام سے شائع ہوا قیمت فی جلد ۱۰/

یہ ہدیۂ ناچیز

کہ نام اِس کا

"سوانحات علامۂ عبدالحکیم سیالکوٹی"

ہے

باجازتِ خاص

فاضلِ اجل عالمِ بے بدل عالی جناب

حضرت حافظ حاجی مولٰنا پیر

سیّد جماعت علی شاہ صاحب

محدّث دام فیوضہ

علیپور سیّداں ضلع سیالکوٹ

کے بابرکت نام پر نہایت ادب و خلوص کیساتھ معنون کیا جاتا ہے

خاکپائے اہلِ ذوق

محمد الدین فوق

# مولٰنا عبدالحکیمؒ

از ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے (سیالکوٹی) پی۔ ایچ۔ ڈی
بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور

مولوی عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ جو شاہان مغلیہ کے زمانہ میں اسلامی علوم کی ایک مشہور درس گاہ تھی۔ ان کی عالمگیر شہرت آخر شاہجہان تک پہنچی۔ جس نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دربار دہلی میں بادشاہ کے اشارہ سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مذہبی و فلسفیانہ مباحث ہوا کرتے تھے جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں وسط ایشیا اور ایران کے حکماء کو محو حیرت کیا کرتی تھیں۔

انکی فلسفیانہ تصانیف میں سیلکوتی علی التصورات ایک مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر میں شائع ہوا تھا۔ اسکے علاوہ ان کی اور بھی کتابیں ہیں جو اسلامی ممالک میں بہت مقبول اور ہردلعزیز ہیں۔ توحید باری تعالیٰ پر بھی ان کا ایک خاص رسالہ جو شاہجہان کی فرمایش سے لکھا گیا تھا میری نظر سے گذرا ہے۔ مگر غالباً آجتک شائع نہیں ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصہ اب تقویم پارینہ ہے۔ لیکن اسلامی فلسفہ کا مورخ اس کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔

سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب اب تک ان کی یادگار ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا مزار جو تالاب کے قریب ہی واقعہ ہے نہایت کس مپرسی کی حالت میں اہل سیالکوٹ کی بے حسی اور مردہ دلی کا گلہ گذار ہے۔

منشی محمد الدین صاحب فوقؔ نے جن کی تاریخی کرید مشہور ہے مولانا مرحوم کے حالات زندگی لکھکر خلق اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ انکی یہ تصنیف نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیگی۔

اس رسالہ میں ضمناً سیالکوٹ شہر کے تاریخی حالات بھی ہیں جو نہایت تجسس اور تلاش سے فراہم کئے گئے ہیں اہل سیالکوٹ کو ان حالات سے بالخصوص دلچسپی ہوگی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۳ء

محمد اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

میرا ایک عرصہ سے ارادہ تھا۔ کہ میں اس فاضل اجل۔ یگانہ روزگار بزرگ کے حالات قلمبند کروں۔ مگر اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کی وجہ سے حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء یا سنہ ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ ایم اے، پی ایچ ڈی، بیرسٹرایٹ لاء لاہور[1] سے کہ وہ بھی اپنے کمال علم و فضل کی وجہ سے سیالکوٹ کے فخر۔ پنجاب کے مایۂ ناز۔ اور ہندوستان کے آفتاب ہیں۔ ذکر آیا۔ بجھے ہوئے جوش اور مٹے ہوئے ارادہ میں پھر حرکت اور تازگی پیدا ہو گئی۔

سنہ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں کے ایّام تھے کہ ارادہ عمل کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ اور چونکہ مولانا کے حالات میں کوئی مستقل کتاب ابتک نہ لکھی گئی تھی۔ اسلئے سوانحات عمری کی تلاش و ترتیب کے لئے بڑی مشکلات پیش آئیں۔ اس سے بھی زیادہ مشکل کام مولینا کی تصنیفات پر جو سب عربی زبان میں ہیں۔ تبصرہ اور تنقید کا تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی تحریک سے مولانا محمود علی صاحب۔ ایم اے پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ تو مجھے بہت بڑا سہارا مل گیا۔ اور میں نے چار ماہ کی محنت اور جستجو کے بعد اس کتاب کو مندرجہ ذیل تین حصّوں میں ترتیب دے دیا۔

[1] گورنمنٹ نے آپ کی اعلیٰ علمی قابلیت کی وجہ سے یکم جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو آپکو نائیٹ ہڈ (سر) کا خطاب دیا ہے۔

۱۔ سوانحاتِ عمر علامہ عبدالحکیمؒ سیالکوٹی۔

۲۔ تاریخ سیالکوٹ۔

۳۔ مشاہیر سیالکوٹ۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے ایام سرما میں جب حضرت حافظ حاجی سیّد جماعت علیشاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری لاہور تشریف لائے تو میں نے اس کتاب کا ذکر کیا۔ حضرت شاہ صاحب قبلہ نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور ارشاد کیا کہ مسودہ کا کچھ حصہ ہمکو سنایا جائے دوسرے دن میں نے کہیں کہیں سے کچھ عرض کیا۔ آپنے مسرت و خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور میری گذارش پر اس کتاب کو اپنے مبارک نام پر معنون کرنا پسند فرمایا۔ بلکہ ارشاد فرمایا۔ "کہ ہمارے لئے یہ بات قابل عزت ہے اور قابل فخر ہے کہ کتاب سوانحات عمر علامہ عبدالحکیم" ہمارے نام پر شائع ہو"۔

میں نے اس کتاب کو مرتب کرنے کیلئے اپنی مختصر سی لائبریری کی چھان بین کی۔ تو مندرجہ ذیل کتابوں میں[۵۱] "فاضل سیالکوٹیؒ" اور "فاضل لاہوری" کے متعلق کہ آپ اس نام سے بھی مشہور تھے۔ کہیں کہیں چند سطور نظر سے گذریں:۔

| نمبر شمار | نام مصنف | سنہ تصنیف | نام کتاب |
|---|---|---|---|
| ۱ | منشی امین چند اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سیالکوٹ | سنہ ۱۸۶۷ء | تاریخ بندوبست سیالکوٹ |
| ۲ | خواجہ عبدالصمد سیالکوٹی | سنہ ۱۳۰۴ھ | تاریخ سیالکوٹ |
| ۳ | مولوی محمد سعید مارہروی | سنہ ۱۳۲۳ھ | آثار خیر |
| ۴ | مولوی محمد الدین مولوی فاضل لاہوری | سنہ ۱۸۷۹ء | روضۃ الادبا |
| ۵ | لالہ رام جس۔ سی۔ آئی۔ ای مدار المہام ریاست کپورتھلہ | سنہ ۱۸۹۷ء | تاریخ ریاست کپورتھلہ |
| ۶ | مولانا محمد الہاشم مرید حضرت مجدد الف ثانیؒ | اصل فارسی سنہ ۱۰۳۷ھ ترجمہ سنہ ۱۳[illegible]ھ | ترجمہ زبدۃ المقامات |

[۵۱] جن تذکروں اور تاریخوں میں سے میں نے اس کتاب کے باقی دو حصوں تاریخ سیالکوٹ اور مشاہیر سیالکوٹ کی ترتیب میں مدد لی ہے وہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں؟

| نام کتاب | سنہ تصنیف | نام مصنف | نمبر شمار |
| --- | --- | --- | --- |
| تاریخ جدولیہ | ۱۲۶۹ھ سنہ ۱۸۵۳ع | مولوی خادم علی سندیلوی | ۷ |
| حدائق الحنفیہ | سنہ ۱۳۱۰ھ | مولوی فقیر محمد جہلمی | ۸ |
| مسالک السالکین جلد اول | سنہ ۱۳۲۸ھ | مولوی مرزا عبد الستار بیگ سہسرامی | ۹ |
| ماثر الکرام فارسی | تصنیف سنہ ۱۱۶۶ھ طبع سنہ ۱۹۱۰ع | مولانا غلام علی آزاد بلگرامی | ۱۰ |
| ماثر الامرار فارسی | بعہد محمد شاہ | صمصام الدولہ شاہ نواز خاں | ۱۱ |
| حسنات العارفین فارسی | سنہ ۱۰۶۴ھ | دارا شکوہ بن شاہجہان | ۱۲ |
| تاریخ کبیر کشمیر فارسی | سنہ ۱۳۲۱ھ | مولوی حاجی محی الدین کاشمیری (وفات ۱۹۲۱ع) | ۱۳ |
| اسرار الابرار فارسی | سنہ ۱۰۶۳ھ غیر مطبوعہ | بابا داؤد مشکواتی کاشمیری | ۱۴ |
| تاریخ خواجہ اعظمی | تصنیف سنہ ۱۱۴۸ھ | خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کاشمیری | ۱۵ |
| روضۂ قیومیہ | ۔ | مولانا خواجہ کمال الدین شیخ محمد احسان معصومی | ۱۶ |
| سبحۃ المرجان عربی | ۔ | مولانا غلام علی آزاد بلگرامی | ۱۷ |
| سکینۃ الاولیاء ترجمہ اردو | ۔ | شہزادہ دارا شکوہ بن شاہجہان | ۱۸ |

اگر زیادہ تجسّس سے کام لیا جائے اور عربی اور فارسی کے تذکروں اور علامہ ممدوح کی تصنیفات پر گہری نظر ڈالی جائے تو ممکن ہے کچھ اور حالات بھی دستیاب ہو سکیں۔ لیکن زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو جمع ہو چکا ہے اسکو شائع کر دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ مختصر سے حالات جو علامہ عبد الحکیم کی روشن زندگی کے دھندلے سے نشان ہیں۔ اس شخص کو خضر راہ کا کام دے سکیں۔ جو اس معمولی سی بنیاد پر اپنے وسیع علم اپنے روشن دماغ اور اپنی اعلیٰ قابلیت سے ایک عالیشان اور فلک نما عمارت تیار کر سکتا ہو۔

میں سیالکوٹ کے محترم بزرگ شمس العلماء مولانا میر حسن صاحب پروفیسر عربی مرے کالج سیالکوٹ اور فدائے ملک و قوم آغا محمد صفدر خاں صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی سیالکوٹی صدر پنجاب خلافت کمیٹی لاہور (حال مقیم سیالکوٹ) کا تہ

دل سے شکر گذار ہوں کہ صاحب اوّل الذکر نے میرے استفسار پر مولانا کے حالات کیلئے مجھے بعض کتابوں کے نام بتائے - اور صاحب مؤخر الذکر نے کتابوں کی ایک معقول تعداد فروخت کرانے کا وعدہ فرمایا۔

اس کتاب کا مسودہ ۱۶ فروری ۱۹۲۳ء کو میں نے از سر نو ترتیب دیا - اسکی وجہ یہ تھی کہ کچھ تو نئے مطالعہ و معلومات کی وجہ سے ترمیم و اضافہ کی ضرورت معلوم ہوتی تھی - اور بڑی وجہ یہ تھی کہ کتاب کا مسودہ دیگر مسودات کے ساتھ ایک الماری میں پڑا رہا - جہاں چوہوں نے کاٹ کاٹ کر اکثر جگہ سے اسکو خراب کر دیا - دوسری دفعہ اس مسودہ کی ترتیب و کتابت نے روزانہ تین چار گھنٹوں کے حساب سے صرف تین ہفتوں میں مجھے فارغ کر دیا۔

شروع مسودہ
۱۶ فروری ۱۹۲۳ء
جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ } بوقت شب

محمد الدین فوق - لاہور
متوطن گھڑتل - ضلع سیالکوٹ
دفتر اخبار کشمیری

ختم مسودہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۳ء

# وطن۔ خاندان اور پیدائش

علامہ عبدالحکیم کا وطن سیالکوٹ تھا۔ یہیں عہد اکبری میں پیدا ہوئے۔ یہیں پرورش پائی۔ یہاں پھلے پھولے اور آخر یہیں انتقال کیا۔

روضتہ الادبا میں ان کے والد کا نام شیخ شمس الدین لکھا ہے۔ معلوم نہیں کس خاندان سے تھے اور کیا کاروبار کرتے تھے۔ لفظ شیخ بزرگی کی وجہ سے بولا جاتا تھا۔ یا نومسلم ہونے کے لحاظ سے۔ یا مولانا کی شہرت نے باپ کی عزت کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ افسوس ہے کوئی تاریخ اور کوئی کتاب اس امر پر روشنی نہیں ڈال سکتی۔

کسی کتاب میں تو نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن سیالکوٹ میں عام طور پر سینہ بسینہ یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ مولینا عبدالحکیم ایک گمنام خاندان اور نہایت ادنےٰ قومیت رکھتے تھے۔ لیکن مولینا اگر فی الواقعہ اعلیٰ ذات سے نہیں تھے تو یہ اور بھی خوبی کی بات ہے۔ اور اسلام نے جو آزادی اور مساوات کی تعلیم دی ہے۔ اُن کی ترقی اُنکی نہ مٹنے والی شہرت اُس کا ایک بدیہی اور روشن ثبوت ہے۔

بعض قوموں کے خیال میں بعض قومیں قدرتی اور ازلی طور پر غلامی اور گمنامی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں قدرت نے خود قوموں کی تقسیم کر دی ہے۔ جس قوم کے حصے حکومت و امارت آگئی ہے وہ اسی زعم باطل میں مبتلا ہے۔ کہ بس اب قیامت تک ہمارا ہی طنطنہ بجتا رہے گا۔ جو قوم غریب۔ پسماندہ اور محکوم ہے۔ اسکا کوئی حق نہیں کہ وہ فاتح قوم کی برابری کا دعوےٰ کر سکے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ جبر و تشدد کی آماجگاہ سمجھی جا رہی ہے۔ لیکن اسلام اس بات کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ غلامی کو مٹانے اور حُرّیت صادقہ کا جھنڈا بلند کرنے کیلئے دنیا میں آیا۔ اور جب تک (انشاء اللہ قیامت تک) جہاں کہیں (خدا کرے ہر جگہ) حقیقی اسلام موجود رہے گا۔ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

اسلام نے حبشیوں اور غلاموں اور چھوٹے درجہ کے لوگوں کو نہ صرف اپنے برابر

بٹھایا بلکہ اُن کو اپنے خون میں مشترک کیا۔ رشتے دیئے۔ نسلی تعصبات مٹائے
جو جاہل تھے ان کو عالم بنایا۔ جو کفر و ضلالت میں مبتلا تھے ان کو نور اسلام سے
منّور کیا ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

ابن خلدون کی مشاہیر اسلام۔ فریدالدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء۔ آزاد بلگرامی کا
مُاثر الکرام۔ اور دوسرے تذکرے دیکھو۔ تم بڑے بڑے علماء، صلحاء اور فقہاء کا
جب حسب و نسب دیکھوگے تو تمکو بیشتر اِن میں موچی۔ کمہار۔ بافندے۔ دھوبی
درزی۔ آہنگر۔ زرکوب۔ عطار اور ایسے ہی اور پیشہ ور نظر آئیں گے جن کا کام کاج
جن کا پیشہ۔ جن کے مشاغل۔ جن کی گذر اوقات تمہاری اُن نظروں میں جو دنیاوی وجاہت
کی متلاشی اور دلدادہ ہیں۔ حقیر و ذلیل معلوم ہوگی۔ لیکن جو خدا کی جناب میں اپنے "اتقا"
کی وجہ سے "مکرّم" اور اپنے کسبِ حلال کی وجہ سے "حبیب" ہیں ؎

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر     تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اسلام وہ چشمۂ فیض ہے کہ بلا تمیز قومیت و رنگت سب کے لئے وقف ہے۔ عورت۔
مرد۔ خورد کلاں۔ امیر غریب۔ سید مغل۔ اسلام نے دینی و دنیوی نافع و کارآمد علوم کی تحصیل
سب کے لئے لازم کردی ہے۔ اسلئے کہ ع بے علم نتواں خدا را شناخت۔ علم کو کسی خاص فرقہ
خاص شخص۔ خاص قوم۔ خاص خاندان یا کسی خاص ملک کی میراث نہیں بنایا۔

اوّل تو کسی کتاب۔ کسی تاریخ۔ کسی تذکرہ میں یہ ذکر نہیں ہے کہ مولانا عبدالحکیم جلالہ
یا بافندہ تھے۔ لیکن اگر تھے بھی۔ تو بھی جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ فخر کا باعث
تھے۔ اُن کی ذات اس قابل ہے کہ اسکو خضر راہ بنایا جائے۔ اور لوگوں کو دکھا دیا جائے
کہ اگر ایسے لوگوں کو جو کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ اور جو اپنی ناداری و کم مائیگی کی وجہ سے
اپنی ترقی و شہرت کے ظاہری اسباب سے محروم ہیں۔ ذراسی بھی جرأت دلائی جائے یا ان کو
اظہار قابلیت کا موقع دیا جائے۔ تو وہ کس طرح زمین سے آسمان۔ فرش سے عرش تک پہنچے

سونا۔ خاک سے کیمیا اور ذرہ سے آفتاب بن سکتے ہیں ؎

ذرہ کا بھی چمکے گا ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہیں

مولانا کے ایک ہم جماعت نواب سعد اللہ خاں تھے۔ جو چنیوٹ کے ایک معمولی زمیندار کے لڑکے تھے۔ لیکن جب ان کے دل و دماغ نے قوت حاصل کی۔ ان کی ذہانت و ذکاوت کے جوہر کھلے۔ اُن کے استاد مولانا کمال نے ان کی تعلیم و تدریس میں خاص دلچسپی لی۔ تو وہ اپنے زمانہ کے علامی و فہامی کہلائے بلکہ شہنشاہ شاہجہان کے دستور معظم بنے۔ اور بادشاہ کی نظروں میں یہاں تک قرب و اقتدار حاصل کیا کہ داراشکوہ جو ولی عہد اور بادشاہ کا سب سے پیارا بیٹا تھا اسکو اپنا مد مقابل سمجھتا اور اس سے خوف کھاتا تھا۔

مولانا ایک غریب خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے ابتداء میں چونکہ گمنام اور غیر معروف تھے۔ اسلئے ان کے سال پیدائش کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ البتہ اتنا تذکرہ ضرور آیا ہے کہ عمر بڑی پائی ہے۔ اور انہوں نے اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ دیکھا ہے۔ اب مجبوراً ہمیں ان کا سال پیدائش دیکھنے کیلئے کسی قدر قیاسات سے کام لینا پڑیگا۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ آپ کے ہم سبق تھے۔ اور ہم مکتبی بلکہ فارغ التحصیل ہونے کے زمانہ میں حضرت مجدد رح کی عمر بقول صاحب السالکین سترہ (۱۷) سال کی تھی۔ اور ہم مکتب و ہم درس ہونے کی وجہ سے غالب قیاس ہے۔ کہ ہم عمر ہوں یا زیادہ سے زیادہ دو چار سال کا فرق ہو۔ بلکہ اس خیال سے کہ حضرت مجدد علیہ الرحمتہ ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ مولانا شائد عمر میں چند سال اُن سے بڑے ہی ہوں۔

حضرت مجدد الف ثانی رح بزمانہ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ لغایت ۱۰۱۴ھ)۔ ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر مولانا عبدالحکیم کو حضرت مجدد رح سے چار سال بھی بڑا سمجھا جائے تو انکا سال پیدائش ۹۶۸ھ نکلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر کو تخت ہندوستان پر مسند نشین ہوئے صرف چھٹا سال گذر رہا تھا۔

مولانا کی پرورش اور تربیت اسی طرح ہوئی جس طرح غریب والدین کے بیٹوں

کی ہوتی ہے۔
ان کی پیشانی سے ستارۂ بلندی کی جھلک ضرور دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اُن کی غربت اس پر پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ اور سوائے اس عالم الغیب کے کوئی متنفس ان کے شاندار مستقبل اور ان کی لازوال شہرت سے آگاہ نہ تھا۔

## فاضل سیالکوٹیؒ کا اُستاد

اکبر نے جب ۹۹۵ھ میں کشمیر کو سلطنت ہند کے ساتھ ملحق کر لیا تو وہاں مغل گورنر مقرر ہونے لگے۔ جن کو ناظم یا صوبہ کہتے تھے۔ اُسی زمانہ میں کشمیر کے ایک جیّد عالم کسی بات پر اکبری گورنر سے ناراض ہو کر سیالکوٹ چلے آئے۔ جہاں اُن کے کئی ہم وطن اُس زمانہ سے موجود تھے۔ جب تاتار خاں حاکم لاہور تھا اور ہندوستان کا تخت شیر شاہ سوری کے پاؤں چوم رہا تھا۔ اور کشمیر کے شیعہ چک بادشاہ علمائے اہل سنت سے اسقدر ظلم و تعصب سے پیش آرہے تھے۔ کہ کئی سُنّی مسلمان ظلم و جبر برداشت نہ کر کے جلاوطنی پر مجبور ہو جاتے تھے۔
اس جیّد عالم اور اس فاضل بزرگ کا نام مولانا کمال الدین تھا۔ سیالکوٹ اسوقت راجہ مان سنگھ کی جاگیر میں تھا۔ اس کا کاردار بڑی عزت سے پیش آیا اور عوام الناس اور خصوصاً اُن کے ہموطنوں نے مولانا کمال الدین کے آنے پہ بڑی خوشی ظاہر کی۔
کشمیر کی تاریخوں میں مولانا کمال کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ ان کا کچھ خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔
مولانا کمال الدین مولانا جمال الدین کے بھائی اور حضرت بابا فتح اللہ حقانیؒ کے مرید و داماد تھے۔ خواجہ عبدالشہید احراری نقشبندی کے ارادت یافتہ بھی تھے۔ انہی دو بزرگوں کی فیض صحبت اور توجہ ظاہری و باطنی سے "علامۂ مشرقین" اور "معلم ثقلین"

مشہور تھے۔ مولانا داؤد مشکواتی اسرار الابرار میں آپ کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

جن و انس اندر تعلّم پیش آں آگاہ بود
نورِ رضا مُلّا کمال الدین ازیں درگاہ بود

کشمیر کے بہت سے تذکروں میں لکھا ہے کہ مولانا کو عالمِ جنات پر بھی فتوحات حاصل تھیں۔ ہم صرف اسرار الابرار سے کہ عہد شاہجہان کی تصنیف ہے اور اس کے مصنف بابا داؤد مشکواتی نے مولانا کمال کے ایک شاگرد سے ملاقات کی ہے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں:۔

بابا داؤد مشکواتی لکھتے ہیں۔ "میں ایک مرتبہ اپنے پیر کی خدمت میں تبت کے ملک میں تھا۔ وہاں مولانا کمال الدین کے ایک شاگرد سے ملاقات ہوئی۔ جس نے مولانا کمال کے کمال کی بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس نے بیان کیا کہ میں مولانا کمال کے مدرسۂ لاہور میں پڑھتا تھا۔ محمد رضا کہ اپنی حکمت و دانائی اور اپنے تبحرِ علم کی وجہ سے حکیم دانا کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ مولانا کے فرزند تھے۔ اور میرے ہم سبق۔ مولانا ہم سب کو درس دے رہے تھے کہ ایک مردِ نورانی نے مولانا کی خدمت میں آکر تعلیم کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے بخوشی قبول فرمایا۔ چونکہ اس شخص سے پہلے کسی کی ملاقات نہ تھی۔ بلکہ کسی نے اس کو دیکھا تک بھی نہ تھا۔ اور اس کے چہرہ سے سفر و کوفت کے آثار بھی ظاہر نہ تھے بلکہ چہرے سے ایک نور برس رہا تھا۔ اس لئے طلبائے تعجب سے اسکا وطن وغیرہ پوچھا۔ اور سفر کی کیفیت دریافت کی۔ مولانا کو خبر ہوئی۔ اُنھوں نے طلباء کو دریافت حالات اور استفسارات سے منع فرمایا چونکہ انسان حریص ہے۔ خصوصاً جس بات سے اُسکو منع کیا جائے اس کی خواہش اُس کو زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم سب نے درس کے بعد اسکو گھیر لیا۔ اور اس سے پھر وہی استفسار کیا۔

ہمارے استفسارات سے تنگ آکر اُس مردِ نورانی نے ایک جست لگائی۔ اور مدرسہ کی دیوار کو ایک ہی چھلانگ میں طے کر گیا۔ ہم سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور ہمت کر کے اس کے پیچھے دوڑے۔ دیکھا۔ کہ ایک گڑھے میں جہاں چند پاک و تازہ ہڈیاں بھی موجود تھیں

بیٹھا ہوا کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے۔ تو اس نے خفگی کے لہجہ میں کہا تم نے کیوں ایسا کام کیا۔ کہ مجھکو ایسے قابل استاد کی صحبت سے محروم ہونا پڑا۔ ہم نے کہا ہم تمہارا راز کبھی افشا نہ کریں گے۔ تم استاد کی صحبت ترک نہ کرو۔ اس نے کہا۔ ہمارے آداب و رسوم کے یہ خلاف ہے کہ جہاں ہمارا راز ظاہر ہو جاوے وہاں ہم اپنی بود و باش رکھیں یہ کہکر وہ پھر ایسا غائب ہوا کہ کبھی اس کی صورت نظر نہ آئی۔

جب اس واقعہ کا علم مولانا کمال کو ہوا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ میں نے تمکو اسی خیال سے منع کیا تھا کہ ایک مومن بھائی کو تکلیف دینا حرام ہے۔ مگر تم لوگوں نے میرا کہنا نہ مانا۔

مولانا کمال کے شاگرد کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ سیالکوٹ کے مولانا لاہور میں بھی ایک درسگاہ رکھتے تھے۔ اور یہ کہ لوگ دور دور سے حصول علم کے لئے کھنچے چلے آتے تھے۔

شیر شاہ سوری کے زمانہ سے لیکر اکبر کے ابتدائی عہد تک میاں وارث کشمیری سیالکوٹ کا ایک نامور مالگذار اور جاگیردار گذرا ہے۔ مولانا کمال الدین نے ان کی عالیشان مسجد میں قرآن۔ حدیث اور دیگر علوم کا درس جاری کیا۔ جہاں علوم کے پیاسے جوق جوق آکر سیراب ہونے لگے۔ مولانا کے فیض صحبت اور تعلیم کی برکت سے فقہ۔ حدیث۔ تفسیر اور منطق و فلسفہ میں ایسے ایسے نامور لوگ پیدا ہوئے کہ مولانا کے کمال کی چاروں طرف شہرت ہو گئی۔ جن شاگردوں نے استاد کا نام روشن کیا۔ ان میں ایک مولانا عبد الحکیم بھی تھے

تاریخ سیالکوٹ میں جو دوسری تاریخوں کی نسبت واقعات سیالکوٹ کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہونی چاہیئے تھی۔ مولانا عبد الحکیم کے اُستاد کا نام "عبد الکریم" درج ہے۔ حالانکہ دیگر تمام قدیم و جدید تذکرے ان کا نام مولانا کمال الدین بتا رہے ہیں۔ جو صحیح و درست ہے۔ مولانا کمال کا سنہ وفات ۱۰۱۷ھ بعہد جہانگیر بتایا جاتا ہے۔ آپ نے سیالکوٹ میں انتقال فرمایا۔ مگر اب مزار کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

آپ کے بھائی مولانا جمال الدین کا تھوڑا سا تذکرہ بھی یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے اسلئے کہ ان کا بھی عالم جنات سے تعلق رہا ہے۔ اور مولانا عبد الحکیم بھی اس عالم سے روشناس

رہے ہیں۔
شیخ نصیر الدین ابو الفقراء۔ کہ کشمیر کے نامور صوفیاء میں درجہ اختصاص رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ملا جمال الدین پھیر گار وقت۔ متقی زمانہ اور علم و فضل کا خزانہ تھے۔ بابا فتح اللہ حقانی کے مریدوں میں تھے۔ میں نے علم حدیث انہی سے اکتساب کیا ہے اور انہی سے سند حدیث حاصل کی ہے۔ حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے مزار پر اکثر جاتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اس شدت کثرت کا سبب پوچھا۔ تو فرمایا۔ ایک مرتبہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عالم خواب میں تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت شیخ ان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلعم نے شیخ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ جمال! تو اس کو پہچانتا ہے۔ اس نے وہ کام کئے ہیں کہ کوئی شخص ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اس زیارت پر میری برابر آمد و رفت ہے۔

بابا داؤد مشکواتی اسرار الابرار میں لکھتے ہیں۔ قاضی ابو القاسم کہ مولانا جمال الدین کے خلف اور اکابر علماء سے تھے۔ اور محمد مسکین کے استاد۔ وہ ایک دن لکڑی کاٹنے کیلئے ایک درخت پر چڑھے۔ درخت بڑا قد آور تھا۔ اور ایک جن کا مسکن تھا۔ درخت پر بڑی مشکل سے ضرب پڑتی تھی۔ جن کو جب تکلیف پہنچی تو وہ آدمی کی شکل اختیار کر کے مولانا کی خدمت میں آیا۔ اور اپنی تکلیف بیان کی۔ مولانا نے اپنے صاحبزادہ کو اس کام سے منع فرما دیا۔

مولانا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی وہ بھی بہت مدت کے بعد تھوڑا سا شوربہ پی لیتے تھے۔ سوائے موٹے پٹو کے ایک لمبے کرتہ کے جسکو کشمیر میں پھرن کہتے ہیں۔ کوئی اور لباس نہیں پہنتے تھے۔ بوریے کے سوا کسی قسم کا فرش نہیں بچھاتے تھے۔ نہ بچھانے کی اجازت دیتے تھے۔ فرماتے تھے۔ جس شخص نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا۔ وہ سلطان جمیع اجسام ہے۔ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

هر که او در کار حق انجام شد     کار او در جملهٔ اجسام شد

سری نگر میں کہ کشمیر کا دار الخلافہ ہے۔ انتقال فرمایا۔

# علامہ عبدالحکیم کے ہم مکتب

سیالکوٹ اور سیالکوٹ کی مسجد میاں وارث "کو جو کشمیری محلہ میں ابھی تک موجود ہے۔ یہ شرف رہا ہے کہ وہاں نہ صرف مولوی عبدالحکیم صاحب جیسے علامہ روزگار ہی پڑھتے رہے ہیں بلکہ نواب سعداللہ خاں وزیر اعظم شاہجہان اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی بھی پڑھتے رہے ہیں۔

"آثار خیر" میں لکھا ہے۔ "ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کا ہندوستان کے مشہور علماء وفضلاء میں شمار ہوتا ہے۔ علامہ سعداللہ خاں کے ساتھ ملا کمال کشمیری سیالکوٹی سے پڑھتے تھے۔ سعداللہ خاں سبق میں ان سے پیچھے تھے۔ مگر قسمت کے معاملہ میں ان سے زیادہ بیش قدم نکلے۔ اور علامی کے خطاب سے موصوف ہو کر بڑھتے بڑھتے شاہجہان کے وزیر ہو گئے"۔

صاحب تاریخ السالکین۔ آثار خیر۔ تاریخ سیالکوٹ صمدی۔ روضہ قیومیہ۔ اور صاحب زبدۃ المقامات نے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عقیدتمندوں میں تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کو مولانا عبدالحکیم کا ہم مکتب اور مولانا کمال کا شاگرد بتایا ہے۔

تاریخ کپورتھلہ میں جو ایک ضخیم سرکاری تاریخ ہے۔ میری نظر سے مولانا کمال کا ایک اور نامور شاگرد بھی گذرا ہے۔ جسکا نام اخوند عبداللطیف تھا۔ اخوند صاحب سلطانپور ریاست کپورتھلہ کے رہنے والے تھے۔ تاریخ مذکور میں لکھا ہے۔ سعداللہ خاں وزیر شاہجہان کے ساتھ اخوند عبداللطیف نے بمقام سیالکوٹ ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ شاہجہان نے ایک مرتبہ شاہزادوں کی تعلیم کے لئے آپ کو دہلی بلوا بھیجا۔ مگر آپ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے زیادہ تکلیف دینی مناسب نہ سمجھی اور شاہزادوں کو بمقام سلطانپور اخوند صاحب کی خدمت میں بغرض حصول تعلیم بھیجدیا۔ جہاں شاہزادے کچھ عرصہ تک زیر تعلیم رہے۔

مولانا کمال کی درسگاہوں سے صدہا ملک بہرہ یاب علم و دستار فضیلت لے کر

نکلے ہونگے۔ مگر مندرجہ ذیل صاحبِ کمال تین شاگردوں علامہ عبدالحکیم۔ حضرت مجدد الف ثانی اور علامی و فہامی نواب سعداللہ خاں نے تو واقعی استاد کے نام کو بقائے دوام کا خلعت پہنا دیا۔

مولانا عبدالحکیم کے دونوں یگانۂ دہر ہم مکتبوں کا ذکر آیا ہے تو خیال بے اختیار عمر خیام نیشاپوری کے دونوں جلیل القدر ہم مکتبوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے جنمیں ایک شاہانِ سلجوق کا نامور وزیر بنا جس کا نام نظام الملک طوسی تھا۔ اور ایک نے نیا مذہب باطنیہ ایجاد کیا۔ اور جسکی کئی پشتوں میں بادشاہی دور دورہ رہا۔ اس کا نام حسن بن صباح تھا۔ خود عمر خیام اعلیٰ درجہ کا فلسفی شاعر تھا جسکی رباعیات ابتک مقبول عام ہیں۔

مولانا عبدالحکیم کے ہم مکتب بھی کچھ کم مشہور نہیں ہوئے۔ سعداللہ خاں نواب کہلایا۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب دار بنا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ پھٹے پرانے بوریئے پہ بیٹھنے والا۔ صاحب قران شاہجہان کا دستور معظم بنا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی نے تو ظاہری و باطنی علوم میں وہ عروج حاصل کیا کہ بڑے بڑے شہنشاہ ان کی چوکھٹ کی جبہ سائی کرتے رہے۔ آپنے تصوف و طریقت کو دوکانداری صوفیوں سے ایسا صاف کیا کہ طریقت و شریعت میں کوئی فرق نہ رہا۔ لاکھوں اور کروڑوں مسلمان اب بھی آپ کی قبر کی زیارت کیلئے سرہند شریف جاتے ہیں۔ عمر خیام نے اگر شاعری میں شہرت حاصل کی تو مولوی عبدالحکیم نے منطق۔ فقہ۔ حدیث۔ تفسیر میں وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان کے علاوہ مصر۔ قسطنطنیہ۔ حجاز۔ بخارا۔ مراکش تک انکا نام مشہور رہے۔

آخر کبھی کسی نے غور بھی کیا؟ کہ مسجدوں کے ٹوٹے پھوٹے بوریوں اور پھٹی پرانی

---

۱؎ حضرت شاہ صاحب قبلہ علیپوری نے ایک مرتبہ بمقام لاہور فرمایا کہ ہم ایام حج میں مقام ینبوع میں تھے چند مراکش مشائخ اپنے خیمہ ڈیرہ سے نکل کر اور یہ سنکر کہ میں شیخ ہندی ہوں میرے پاس آئے اور پوچھا کیا تم ہندی ہو؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ مراکشی شیخ نے پوچھا۔ کیا سیلکوت (سیالکوٹ) کو بھی جانتے ہو؟ میں نے کہا وہ تو میرا وطن ہے۔ پھر کہا۔ مولائے عبدالحکیم سیلکوتی تمہارے ہم وطن تھے؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ یہ کہکر فرط محبت و شوق سے تمام مشائخ یکے بعد دیگرے مجھ سے بغلگیر ہوتے رہے۔

چٹائیوں پر بیٹھنے بلکہ سونے والے۔ ہاتھوں اور کتابوں بلکہ اینٹوں کا سرہانہ بنانیوالے۔ پھٹے ہوئے کپڑے بلکہ چیتھڑے پہننے والے۔ اس زمانہ میں جبکہ ریل گاڑی نہ تھی۔ موٹریں اور لٹینیں نہ تھیں۔ رستے ایسے پُر امن نہ تھے۔ رشتہ داروں سے۔ عزیزوں سے۔ اپنے وطن سے جدا ہوتے تھے۔ اور جب مسجدوں کے حجروں سے جہاں موجودہ روشنی کے زمانہ میں نئے تعلیم یافتہ اگر آجائیں تو شائد انکا دم گھٹنے لگے۔ ان چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں سے جنکو شائد موجودہ زمانہ میں بلیک ہول کہہ سکتے ہیں نکلتے تھے۔ تو کیوں ان کو علّامۂ زمان۔ فہامۂ دوراں فقیہہ فاضل۔ محدّث کامل۔ قطب الاقطاب۔ اور جامع علوم ظاہری و باطنی کے خطابات ملتے تھے۔ کیا وجہ تھی کہ لوگ دیوانہ وار ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے پیچھے دوڑتے تھے۔ اور ان کی ادنےٰ سی ادنےٰ خدمت کو بھی فخر کا باعث بلکہ "حاصل زندگانی" سمجھتے تھے۔

مُلّا کمال بے یار و مددگار اپنے ملک (کشمیر) سے نکلتا ہے۔ لیکن جب وہ پنجاب میں آتا ہے تو لوگ اُسے آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ حاکم اُسکا ادب کرتے ہیں۔ زبان الگ ملک الگ۔ لباس اور طرز معاشرت الگ۔ لیکن خلقت ہے کہ جوق جوق اُس کے پاس آتی ہے۔ ادبائے وقت اور فضلائے عصر اُسے "محقق سیالکوٹی" بلکہ "علّامۂ مشرقین" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں!۔

سعداللہ جو پھٹے پُرانے کپڑوں کے ساتھ اپنے وطن چنیوٹ سے باہر نکلتا ہے۔ لاہور اور سیالکوٹ میں حصول تعلیم کے بعد شاہجہان جیسے عظیم القدر شہنشاہ کا وزیر ہوتا ہے۔ جسکی حضوری و حاضری کیلئے بڑے بڑے راجے۔ مہاراجے اور نواب اور صوبیدار اور جاگیردار پہروں کھڑے رہتے تھے!۔

شیخ احمد سرہندی جب فارغ التحصیل ہو کر مسجدوں کے حجروں اور معمولی سی درس گاہوں سے باہر نکلتے ہیں تو علّامہ ابو الفضل اور ملک الشعرائے فیضی جن سے بڑھکر عہدِ اکبری میں کسی کو تقرب شاہی حاصل نہ تھا۔ ان سے ملاقات کرنا۔ اور ان کے پاس جانا باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور جب دنیا ان کے کمالات سے آگاہ ہوتی ہے تو آج شیخ احمد سرہندی کو زبان خلق سے سلطان طریقت۔ برہان حقیقت۔ امام الشریعت۔ حضرت مجدد

الف ثانی اور فضائے آسمانی سے خزینۃ الرحمت کے خطابات ملتے ہیں!۔

آخر کیا وجہ تھی؟ کیا سبب تھا؟ کہ زمانہ سابق میں معمولی لوگ غیر معمولی طور پر عزت و شہرت اور علم و فضل میں کمال حاصل کر لیتے تھے۔ ان کو سامان آرائش و راحت بھی میسر نہ تھے۔ بلکہ بعض حالات میں تو گداگری کر کے شکم پری کرنی پڑتی تھی۔ وہ ایثار و اخلاص۔ وہ حقیقی تڑپ جو شارع اسلام نے ہمکو بتائی ہے کہاں ہے؟ کس جگہ ہے؟ اور کس طرف ہے؟ اسی ایثار و اخلاص اور اسلام کی اسی حقیقی تڑپ کے نہ ہونے سے ہمارا وہ حال ہے کہ خود ہمیں ہی اپنے حال پر کہنا پڑتا ہے ع اللہ بُرا حال ہوا ایسا نہ کسی کا۔

نواب سعد اللہ خاں ہندوستان کے وزیر اعظم ہوں۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کہلائیں۔ مولانا عبدالحکیم علامی وقت مشہور ہوں اور تینوں ہم مکتب رہیں اور پھر انکی باہمی خط و کتابت۔ علمی بحث مباحثہ۔ شریعت و طریقت۔ منطق و فلسفہ اور فقہ و حدیث کے رموز و نکات کے انکشافات سے دنیا بے خبر ہو! کسقدر افسوس و حسرت کا مقام ہے ان تینوں یگانۂ روزگار ہم مکتبوں میں سے صرف حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات شریف محفوظ ہیں یا بعض ایسی کتب موجود ہیں جنمیں حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خلفاء وغیرہ کے حالات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ باقی دونوں اصحاب کے ملفوظات کا کوئی پتہ نہیں ہے ایام طالب علمی میں جو لطیف علمی بحث آپسمیں ہوتی ہوگی۔ اور مولانا کمال جیسا باکمال استاد جس ترکیب سے علمی دقائق کی موشگافیاں کرتا ہوگا۔ کاش ان کا پتہ چل سکتا!

---

# مولانا عبدالحکیم اور حضرت مجدّد الف ثانی

علامہ عبدالحکیم اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے باہمی تعلقات کی کچھ کیفیت زبدۃ المقامات اور روضۂ قیومیہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم دونوں کا خلاصہ یہاں درج کر کے دونوں نامور ہم مکتبوں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے سے پہلے حضرت مجددؒ کے مختصر سے ابتدائی حالات بھی لکھتے ہیں۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر ابھی اسلام اور علمائے اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ بقول صاحب دربار اکبری وہ مسجدوں میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔ نمازیں پڑھتا اور علمائے اسلام کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہ کرتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی اُسکا پیش امام تھا۔ اور علماء و صلحاء کا جمگھٹا اس کے گرد رہتا تھا۔

اکبر ۹۶۳ھ میں تخت پر بیٹھا۔ اور اٹھارہ سال یعنی ۹۸۱ھ تک وہ ایک خالص مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے ہندوستان پر فرمانروائی کرتا رہا۔ اس کے بعد جب اُس کے دربار میں ابوالفضل۔ ملک الشعراء فیضی۔ راجہ بیربر۔ ٹوڈرمل اور دوسرے لوگ آتے ہیں اور اپنی ملکی مصلحتوں سے اور اپنے منطق و فلسفہ کے زور سے اُس کے دین و ایمان کو متزلزل کرتے ہیں تو ہندوستان میں اسلام کی حالت ضعیف و ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔

اکبر اپنی ملکی مصلحتوں اور اپنی ہندو رانیوں کے پاس خاطر سے زنار پہنتا ہے۔ بتخانوں میں جاتا ہے۔ ڈاڑھی منڈاڈالتا ہے۔ کبھی کبھی پیشانی پر قشقہ بھی لگالیتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں شرکت کرتا ہے۔ درباری آداب کی ابتداء سجدہ سے ہوتی ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ مسلمانوں کا۔ ان کے مذہب کا اور عالمانِ دین کا مذاق اڑایا جاتا۔ اور اُن پر استہزاء کیا جاتا ہے۔ الحاد و فلسفہ کی کتابیں تحریر کیجاتی ہیں۔ علماء و صلحائے عصر۔ ابوالفضل و فیضی کے عروج و اقبال کے سامنے خاموش۔ اور اہل دین گرداب حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۹۸۷ھ تک آپ نے اپنے والد ماجد مخدوم عبدالاحد سے تحصیل علوم کی۔ پھر سیالکوٹ جاکر مولانا کمال کاشمیری سے جو محقق و مدقق علامۂ روزگار عابد و زاہد تھے۔ معقولات کی کتابیں جنہیں مولانا ممتاز تھے۔ نہایت تحقیق و تدقیق سے پڑھیں اور حدیث کی سند مولانا یعقوب صرفی کاشمیری سے جو شیخ خوارزمی کبروی کے خلیفہ اعظم اور اپنے زمانہ کے محدث اعظم تھے . . . . حاصل کی۔ بلکہ سلسلہ کبروی میں آپ مولانا صرفی کے مرید ہوئے۔

یہ تمام علوم آپ نے ۲۱ سال یعنی سن بلوغت سے قبل ہی حاصل کر لئے۔ یا دوسرے الفاظ میں ۹۹۲ھ میں آپ تمام ظاہری علوم سے فارغ ہو گئے۔ اور واپس آکر سرہند ہی میں اپنے والد ماجد کے حضور میں طلباء کو درس دینے لگے۔

آپ نے ابوالفضل اور فیضی سے آگرہ میں کئی ملاقاتیں کی ہیں۔ اور علوم فلسفہ پر ان سے کئی مرتبہ بحث کی ہے۔ بلکہ انہی مناظروں کی بنا پر ایک کتاب بھی اثبات نبوت کے نام سے لکھی ہے۔ ابوالفضل وغیرہ نہ صرف فرشتوں کے وجود سے منکر تھے بلکہ ان کو آنحضرت صلعم کی نبوت پر بھی یقین نہ تھا۔ اسلام کے لئے یہ بڑا نازک زمانہ تھا۔ حضرت مجدد صاحب نے احیائے سنت و شریعت کیلئے نہ وزیر کی پرواہ کی نہ بادشاہ کی۔ جو کچھ اللہ اور اللہ کے رسول نے فرمایا ہے اسکا برملا ذکر کرتے رہے۔ آپ کو تکلیفیں بھی پہنچیں۔ بلکہ جہانگیر کے زمانہ میں بعض بدبیں حاسدوں کی وجہ سے گوالیار کے قلعہ میں قید بھی رہے۔ مگر اظہار حق اور اشاعت سنت و اتباع شریعت کے معاملات میں کسی سے نہ ڈرے۔ آخر جہانگیر نے معافی مانگی۔ شاہجہان (شاہزادہ خرم) مرید ہوا۔ اور دوسرے کئی علماء اور امرائے دربار نے آپ سے بیعت کی۔ آخر ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو بزمانہ جہانگیر آپ وفات پا گئے۔

تجدید الف و قیومیت کا بارھواں سال تھا۔ اور سنہ ہجری ایک ہزار بائیس منزلیں طے کر چکی تھی کہ مولوی عبدالحکیم اور حضرت مجدد رحمۃ اللہ جن میں زمانہ طالب علمی کے تیس ۳۰ سال بعد از سر نو تعلقات قائم ہوئے۔ اس طویل عرصہ میں دونوں نامور ہم مکتبوں کی شہرت دور دراز ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔ مولانا عبدالحکیم جاگیردار ہو چکے تھے۔ اور ان کے علم کلام، علم منطق و فلسفہ اور تفسیر و حدیث کی دھوم مسجد کے حجروں سے نکلکر امراء کے مکانوں۔ وزراء کے

ایوانوں اور بادشاہ کے فلک نما محلوں تک جا پہنچی تھی۔ اور حضرت شیخ احمد سرہندی امام الشریعت۔ قیوم اوّل اور مجدد الف ثانی کے خطابات سے ممتاز تھے۔ اور سرہند صرف آپکے دم قدم کی وجہ سے علم و فضل۔ علمائے عصر اور عابد لوگوں کا ایک مرکز ہوگیا تھا۔

سنہ ۱۰۲۲ھ کا واقعہ ہے کہ مولانا کا ایک شاگرد جو تمام شاگردوں سے لائق۔ ذکی اور ذہین تھا۔ اور مولوی صاحب بھی اسکی رسائے طبیعت کی وجہ سے اسکو تمام شاگردوں سے عزیز سمجھتے تھے۔ اتفاقاً ایک مرتبہ متواتر چند یوم تک درس میں نہ آیا۔ مولوی صاحب نے ایک آدمی خبر کیلئے اور متواتر غیر حاضری کی وجہ دریافت کرنے کیلئے بھیجا۔ وہ شاگرد اُسی وقت حاضر خدمت ہُوا۔ اور کہنے لگا۔ اس مسلسل غیر حاضری کیوجہ یہ تھی کہ چند ورق میرے ہاتھ لگے ہیں اُن کے مطالعہ نے ایسی لذّت دی اور ایسا استغراق پیدا کیا ہے کہ کسی اور کتاب کی طرف جی نہیں چاہتا۔ ساتھ ہی وہ چند اوراق نکال کر مولوی صاحب کو دیئے اور کہا کہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جب مولانا نے ان اوراق کا مطالعہ کیا تو اسمیں ایسا کلام درج پایا جس کے علوم و معارف بالکل نئے اور شریعت غرا کے عین مطابق تھے۔ مولوی صاحب نے پوچھا یہ کس بزرگ کا کلام ہے۔ ایک شخص نے جو پاس ہی بیٹھا تھا اور سرہند میں حضرت مجدد صاحب کی مجلسوں میں شامل رہ چکا تھا کہا یہ کلام حضرت مجدّد الف ثانی کا ہے

اس دن سے مولوی عبدالحکیم کو حضرت مجدّد الف ثانی کے علوم و معارف کے مطالعہ سے وہ لذت ملی کہ حضرت کی ذات خاص سے آپ کو دلی اعتقاد پیدا ہوگیا۔ اس واقعہ کو ابھی چند یوم ہی گذرے تھے کہ مولوی صاحب نے حضرت مجدّد الف ثانی کو خواب میں دیکھا کہ وُہ مولوی صاحب سے قرآن کی یہ آیت فرما رہے ہیں " قل اللّٰہ ثمّ ذرھم فی خوضھم یلعبون "۔ مولوی صاحب جب خواب سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ سینہ کے اندر ایک نور برس رہا ہے۔ دل ہے کہ خود بخود ذکر کر رہا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ سارے بدن پر اس کا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ دُعا و توجہ کیلئے حضرت کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ اور لوگوں سے کہنے لگے میں حضرت شیخ احمد مجدّد الف ثانی کا اویسی ہوں۔

خواجہ ہاشم مصنف زبدۃ المقامات لکھتے ہیں۔ ایک روز حضرت قیوم اوّل کی مجلس میں تمام مرید حاضر تھے۔ وہاں ذکر چھڑا کہ آنجناب کی تجدید الف اور قیومیت ہم لوگوں پر تو اظہر من الشمس ہے۔ لیکن اگر کوئی عالم جو علمائے عصر میں مرتبہ بلند رکھتا ہو اور جسکی سند کو سب لوگ تسلیم کرلیں اس امر کی تائید کرے تو بہت اچھا ہو۔ خواجہ ہاشم جو مولانا محمد الہاشم کشمی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ لکھتے ہیں میں نے خود یہ الفاظ اپنی زبان سے حضرت قیوم اول کی خدمت میں عرض کیئے۔ فرمایا۔ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کو جانتے ہو۔ آج اہل علم میں ان کا کیسا مرتبہ ہے؟ سب نے بالاتفاق عرض کیا آج معقول ومنقول میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ یکتائے زمانہ ہیں آنجناب نے فرمایا۔ مولوی صاحب نے میری طرف ایک خط لکھا ہے۔ اُسے دیکھو۔ یہ کہکر وہ خط ان کے آگے رکھا۔ جب کھولا گیا تو اسمیں بہت سے مدحیہ فقرے آنحضرت قیوم اوّل کے بارہ میں تھے اور انہی میں یہ الفاظ بھی درج تھے۔ "امامِ ربّانی محبوبِ سبحانی مجدّد الف ثانی"۔ اسی خط میں مولانا نے اپنی خواب کا واقعہ لکھا تھا۔ بیان کیاجاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا خط ہے جو مولوی عبدالحکیم نے حضرت مجدّد الف ثانی کو لکھا ہے۔[۵۱]

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدّد الف ثانی مولوی عبدالحکیم کا کسقدر احترام کرتے تھے۔ اور ان کے عطا کردہ خطاب مجدّد الف ثانی کو اپنی تجدید کی بہترین سند سمجھتے تھے۔ وہ خطاب ایسا مشہور و مقبول ہوا کہ حضرت کے تمام خطابات قیوم اوّل "خزینۃ الرحمۃ" وغیرہ سے اسکو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ بلکہ بہت لوگ ایسے ہیں جو اِس مقبولِ عالم خطاب مجدّد الف ثانی کے مقابلہ میں ان کے اصل نام "شیخ احمد" سے بہت کم آگاہ ہیں۔

مولوی عبدالحکیم اور حضرت مجدّد الف ثانی کے درمیان سنہ ۱۰۲۳ھ یا ۱۰۲۴ھ میں ایک ملاقات بھی ہوئی ہے۔ صاحب زبدۃ المقامات تو یہ لکھتے ہیں مولوی صاحب "قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْہُمْ" کی تفسیر و تعبیر کیلئے خود سیالکوٹ سے سرہند آئے۔ روضۃ القیومیہ میں اس آیت کی تفسیر

---

[۵۱] روضۃ الاذکار اور روضۃ القیومیہ نے بھی اس خط کی تائید کی ہے۔

طلبی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ویسے لکھا ہے کہ مولوی صاحب خواب کے اس واقعہ کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔

حضرت مجدد اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے مصنف و شارح اور اپنے قابل ہم مکتب سے بڑے اخلاص سے ملے۔ مولانا بہت دنوں تک سرہند رہے اور جبتک رہے ظاہری و باطنی علوم کی صحبتیں گرم رہیں۔

اسی ملاقات میں مولوی عبدالحکیم نے حضرت مجدد الف ثانی سے بیعت کی۔

مولوی عبدالحکیم نے تجدید الف کے اثبات میں ایک رسالہ بھی "دلائل التجدید" کے نام سے لکھا۔ روضہ قیومیہ میں اس رسالہ کے متعلق لکھا ہے کہ اسمیں مولانا نے نہایت قوی دلائل و براہین بیان فرمائے ہیں۔

مولوی عبدالحکیم جب سرہند سے واپس آئے ہیں تو ان کے نام کے ساتھ دربار قیومیت سے "آفتاب پنجاب"[۱] کے خطاب و الفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یعنی وہ جو صرف علوم ظاہری کا آفتاب تھا اب باطنی و روحانی فیوضات میں بھی شمس بازغہ ہو کر نکلا۔

---

## مولوی عبدالحکیم عہد اکبری میں

اکبر کی علمی قدردانی نے ہندوستان کے علاوہ ایران۔ توران۔ عرب عجم۔ روم شام و کشمیر جنت نظیر کے علماء، فضلاء اور اہل کمال ہندوستان میں جمع کر رکھے تھے۔ آئین اکبری اکبرنامہ اور مولانا آزاد کی کتاب دربار اکبری میں علماء و فضلاء کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ مگر ان میں مولوی عبدالحکیم کا نام کسی جگہ درج نہیں ہے۔ جن کی عمر اکبر کے سنہ وفات سنہ ۱۰۱۴ھ تک ۴۵۔ ۴۶ سال کے قریب تھی۔ اور جنکی علمی شہرت ہندوستان کے ہر گوشہ میں بہ لگا کر اڑ رہی تھی۔

مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کی رسائی اکبر کے دربار تک نہ ہو سکی تھی

---

[۱] روضۃ الادبا۔

مگروہ اکبر کے عالیشان مدرسہ لاہور میں سرکاری مدرّس مقرر ہو گئے تھے۔ جہاں صدہا طلباء آپ سے علوم ظاہری حاصل کرتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کافی مدت تک لاہور میں مقیم رہے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ " فاضل لاہوری " کے نام سے مشہور ہو گئے چنانچہ حمداللہ شارح سلم آپ کے قول کو " قال الفاضل اللاھوری " لکھ کر بیان کرتا ہے۔ روضتہ الادباء میں بھی آپ کے قیام لاہور کا ذکر ہے اور لکھا ہے منطق میں علمائے پورب (صوبجات متحدہ آگرہ و اودہ) سے آپ کے اکثر بحث مباحثہ رہتے تھے۔ کیا کیا باتیں ہونگی۔ کیا کیا نکات ہونگے۔ کچھ ادھر سے دلیلیں کچھ اُدھر سے بُرہان۔ ان مناظروں اور مباحثوں کی کیفیتیں کیسی دلچسپ ہونگی۔ اور کن کن کتابوں سے جنکا آج شاید لوگ نام بھی نہ جانتے ہوں اپنے اپنے مطالب کے حوالے دیئے جاتے ہونگے۔ تقریروں میں کیا متانت اور تحریروں میں کیسی مؤدبانہ لطافت ہوتی ہوگی۔ ان کا مزا اب صرف عالم خیال ہی میں آسکتا ہے۔

---

## مولوی عبدالحکیم عہد جہانگیری میں

جب جہانگیر اپنے باپ (اکبر) کے بعد (سنہ ۱۰۱۴ھ میں) تخت پر بیٹھا۔ تو علماء و فضلاء کی قدردانی میں اُس نے اور بھی اضافہ کیا۔ انکو جاگیریں دیں۔ معافیاں دیں تاکہ یہ لوگ اطمینان قلب سے اشاعت علوم کر سکیں۔ مولوی عبدالحکیم اس زمانہ میں لاہور کی سرکاری درسگاہ میں مدرّس اعلیٰ تھے۔ ان کا شہرۂ کمال بھی (معلوم نہیں کس ذریعہ سے؟) جہانگیر تک پہنچا۔ مدد معاش کے نام سے ایک معقول جاگیر مولانا کے نام مقرر ہو گئی۔

جہانگیر کی آپ پر خاص توجہ تھی۔ بادشاہی عنایات کی وجہ سے اب آپ اہل حشمت و صاحب وسعت ہو گئے تھے۔ علمائے ہند مسائل دینیہ میں آپ سے فتاوے طلب کرتے اور چونکہ اُس زمانہ میں تعلیم بالکل مفت ہوتی تھی۔ اسلئے طلباء آپ کے درس میں دُور دُور سے آتے اور صاحب علم و فضل ہو کر نکلتے تھے۔

"آثار خیر" میں عہد جہانگیری کے جن سولہ مسلمان عالموں کا ذکر ہے انمیں ایک نام مولانا عبدالحکیم کا بھی ہے۔ آپ عہد جہانگیر تک لاہور ہی میں قیام فرما رہے ہیں۔ لاہور کے صوفیائے کرام سے آپنے بہت ملاقاتیں کی ہونگی، مگر تاریخوں سے صرف یہی پتہ چلا ہے کہ حضرت میانمیر رح سے ملاقات فرمائی ہے۔ جسکی کچھ کیفیت شہزادہ داراشکوہ کی کتاب سکینۃ الاولیاء سے ذیل میں لکھی جاتی ہے:۔

ایک دن شہنشاہ جہانگیر حضرت میانجی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملا عبدالحکیم بھی حاضر خدمت تھے۔ حضرت نے فرمایا اللہ تعالٰے کے پاس پہنچنے کے دو طریقے ہیں۔ اوّل جذبہ۔ کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالٰے یکبارگی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتا اور اس کو واصل بنا لیتا ہے۔ دوسرا سلوک جو ریاضت مجاہدہ اور کسی بزرگ کا دامن پکڑنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طریق کی تفصیل اس طرح ہے کہ سالک کا پہلا مقام ملکوت ہے۔ جب ریاضت کے زور سے وہ اس مقام پر کہ عالم ملکوت کا کشف اسی مقام سے شروع ہوتا ہی پہنچ جاتا ہے تو اسکا پیر اُسے کسی طریقہ میں مشغول کرکے جنگل میں بھیج دیتا ہے۔ اور وہ باغوں اور جنگلوں میں تنہا یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتا ہے اور یہ اسلئے کیا جاتا ہے کہ قرب حق کے حصول کیلئے خلقت سے کنارہ کشی ضروری ہے۔

مولانا عبدالحکیم حضرت میانمیر رح کے فضائل و مراتب سے آگاہ تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ بادشاہ ان کا عقیدتمند ہے۔ اور ان کا بہت کچھ ادب و احترام کرتا ہے۔ اور شہر کے عام ہندو مسلمان بھی ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ انکو یہ بھی معلوم تھا کہ خود شہنشاہ اس وقت ان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ حضرت میانمیر رح کے ان الفاظ پر وہ خاموش نہ رہ سکے اور بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا:۔

آپنے جو کچھ بیان فرمایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ عین رہبانیت کی تعلیم ہے۔ اور اسلام اس تعلیم کی اجازت نہیں دیتا (اگر اور باتوں کی طرف خیال نہ بھی کریں تو یہ تھوڑی بات ہے) کہ اس سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے۔

آنجناب (یعنی حضرت میانجی) نے فرمایا۔ تعجب ہے کہ آپ ایسا فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کو لازم ہے کہ نماز کی تحقیق کریں۔ اور دل کی حضوری حاصل کریں۔ تاکہ ان کی نماز درست ہو سکے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تک دل کی حضوری نہ ہو نماز درست نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں نماز باجماعت کا کیا فائدہ؟۔ یاد رکھو اگر × × × × × ×

× × × × × × × × × × × آبادی سے دور جنگل میں بھی نکل جائیں تو بھی نماز باجماعت نہیں ہو سکتی۔ ہمارے یار ادھر ادھر کے جنگلوں کے تلے آبادی سے دور گوشہ تنہائی میں یاد الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ہم سب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مِل کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔

دارا شکوہ نے یہ قصہ یہیں تک لکھکر ختم کر دیا ہے۔ آگے صرف اتنا لکھا ہے۔ بادشاہ (جہانگیر) اس مرتبہ بھی ایک پہر تک حضرت میاں جی کی خدمت میں حاضر رہا۔

---

## مولوی عبدالحکیم اور شہنشاہ شاہجہان

اکبر کے زمانہ میں مولوی عبدالحکیم لاہور کے سرکاری مدرسہ میں مدرس اعلیٰ تو تھے۔ لیکن ان کے کمالات کی شہرت بادشاہ تک نہ پہنچ سکی۔ یا کسی نے پہنچانی مناسب نہ سمجھی۔ جہانگیر کی نگاہ نکتہ رس نے ان کو تاڑا اور انکی مدد معاش مقرر کر کے ان کی شہرت و عظمت کا بنیادی پتھر رکھ دیا۔

شاہجہان کا ابتدائی عہد تھا۔ کہ مولانا عبدالحکیم اکبرآباد (آگرہ) کے سرکاری مدرسہ میں جو اکبر کا جاری کیا ہوا تھا۔ مدرس اعلیٰ بنا کر بھیجے گئے۔ حاجی محمد جان قدسی[۵]۔ جو شاہجہان کے زمانہ کا ایک نامور شاعر تھا۔ اور مولانا عبدالحکیم اس مدرسہ میں ایک ہی وقت میں اُستاد رہے ہیں۔

"آثار خیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عالیشان مدرسہ کی کچھ عمارت شروع انگریزی عہد تک موجود تھی۔ شہنشاہ اکبر نے اس مدرسہ کے لئے شیراز سے چلپی بیگ ایک نامی فاضل کو بلوایا تھا۔ ایک وسیع و خوبصورت مسجد بھی اس مدرسہ کے ساتھ تھی۔

۵ وطن مشہد۔ مدفن کشمیر ... دائرہ ... الشعراء ...

کیا انقلاب زمانہ ہے جہاں مدرسہ کی عالیشان عمارت تھی۔ جہاں فقہ و حدیث اور تفسیر قرآن اور منطق و فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ جہاں علم و فضل کے دریا بہتے تھے جہاں ادب و تاریخ کا مینہ برستا تھا۔ جہاں ملک کے نامور اور چیدہ علماء تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے تھے۔ آج نہ وہاں مدرسہ ہے نہ دارالاقامہ کا کوئی پتہ ہے۔ البتہ مسجد مذہب کی پناہ میں آ کر اب تک موجود ہے۔ اور مدرسہ کے نام پر مسجد کے متصل ایک محلہ۔ محلہ مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔

مولوی عبدالحکیم جہانگیر کے زمانہ میں جاگیر حاصل کرنے کی وجہ سے دربار میں بھی رفتہ رفتہ شہرت حاصل کر رہے تھے۔ شاہجہان کے زمانہ میں پہلے تو آگرہ بھیجے گئے۔ مگر بعد میں غالباً دربار میں بھی پہنچ گئے۔ اسلئے کہ اکثر کتابوں میں اس امر کا تذکرہ پایا جاتا ہے کہ ایران و توران اور عرب و شام تک کے علماء اور اہل کمال دربار شاہجہان میں موجود تھے۔ مگر ان سب میں بلحاظ قابلیت مولوی عبدالحکیم کا پایہ بلند تھا۔"

ان کے اسقدر عروج اور انکی شہرت و عظمت اور شاہجہان کے دربار تک پہنچنے کی مختلف روائتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہم صرف یہاں دو روائتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

ایک روائیت جو سیالکوٹ کے ہر فرد و بشر اور پنجاب کے اکثر حضرات کو معلوم ہے یہ ہے کہ مولوی صاحب کے گھر میں ان کے خاندان سے کوئی عورت بیمار تھی۔ حکماء یا تجربہ کار عورتوں نے اس بیماری کا علاج تر و تازہ اور سبز لونگ بتایا۔ اس وقت چونکہ سبز اور تازہ لونگ کا ملنا محال تھا۔ اسلئے مولوی صاحب متفکر تھے۔ اسی اثناء میں اُن کے مدرسہ کا ایک طالب علم شیر دل نام ان کی خدمت میں آیا۔ اُن کو متردّد دیکھ کر سبب پُوچھا۔ مولوی صاحب نے سبز لونگوں کی ضرورت ظاہر کی۔ طالب علم نے کہا آپ فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ سبز لونگ جسقدر مطلوب ہونگے تھوڑی دیر تک حاضر کر دونگا۔ چنانچہ وہ لڑکا مولوی صاحب سے رخصت ہو کر قریباً دو گھنٹہ تک ان سے علیحدہ رہا۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ دو گھنٹے اس نے کہاں گذارے ۔ اور وہ اس عرصہ میں کیا کام کرتا رہا۔ لیکن دو گھنٹہ کے بعد جب وہ مولوی صاحب کے پاس آیا۔ تو مولوی صاحب کے علاوہ اور لوگوں نے بھی دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں سبز لونگوں کا درخت معہ بیخ و بن موجود ہے اور اس کے ساتھ لونگ تر و تازہ ضرورت سے صدہا حصہ زیادہ لگے ہوئے ہیں۔

لوگ حیران تھے لیکن مولانا کے ادب کیوجہ سے کچھ دریافت نہ کر سکتے تھے ۔ مولوی صاحب نے لونگ تو گھر بھجوا دیئے ۔ اور کسی دوسرے وقت تنہائی میں شیر دل سے کہا تم جو کچھ ہو مجھے معلوم ہو گیا ہے ۔ میری یہ خواہش ہے کہ اب تم مدرسہ سے چلے جاؤ ۔ اور پھر کبھی یہاں آنے کا نام نہ لو ۔ اسلئے کہ جنات کا انسانوں میں رہنا مناسب نہیں ہے۔

شیر دل نے ہر چند منت سماجت کی اور کہا ۔ میں جو کچھ ہوں آپ سے اب پوشیدہ نہیں ہے ۔ لیکن آپکا غلام اور فیض یافتہ ہوں ۔ اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیئے ۔ حضرت نے ایک نہ سنی ۔ آخر وہ جن طالب علم زبان حال سے ع بہر جا کہ باشم غلام توام ۔ کہکر اور یہ الفاظ ادا کر کے رخصت ہو گیا ۔ اگر زندگی ہے تو ضرور کسی وقت اُستادی کا حق ادا کرونگا ۔ ورنہ بالخیر شما بہ سلامت ۔

اس واقعہ کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا ۔ کہ دہلی میں ایک شہزادی سخت بیمار ہو گئی علاج معالجہ سے جب کوئی آرام نہ آیا تو سیانے لوگوں نے یہ بتایا کہ کوئی آسیب ہے جس نے شہزادی کو تنگ کیا ہوا ہے ۔ بڑے بڑے کامل آئے ۔ ٹوٹکے اور افسوں ہوئے مگر وہ آسیب دُور نہ ہوا ۔ جب عامل تھک گئے تو وہ آسیب شاہزادی کی زبان سے کہنے لگا ۔ میں وہ زبردست آسیب ہوں کہ جب تک مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی نہ آئیں گے ۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتا ۔ بادشاہ نے صوبۂ لاہور کی معرفت بہ اعزاز تمام مولوی صاحب کو دہلی بلوا بھیجا ۔ جب مولوی صاحب نے حدود دہلی میں قدم رکھا ۔ تو شاہزادی کی حالت دفعتہً رو بصحت ہونے لگی ۔ اور جب وہ دہلی پہنچ گئے تو شاہزادی بالکل تندرست ہو گئی یا دوسرے الفاظ میں وہ آسیب چلا گیا ۔

بادشاہ نے مولانا کو بہت سا انعام واکرام عطا فرمایا۔ بہت بڑی جاگیر عطا کی اور مقربان بارگاہ شاہی میں داخل فرمایا۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے جو ہر چند پہلی وجہ کی نسبت کسی قدر زیادہ وزن دار نظر آتی ہے۔ مگر واقعات اس کے بھی خلاف ہیں۔ جسکا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب نواب سعد اللہ خاں شاہجہان کے وزیر ہوگئے تو انہیں اپنا عالم و فاضل ہم مکتب مُلّا عبد الحکیم یاد آیا۔ اور اونہوں نے اسکو دہلی بلالیا۔

اگر یہ وجہ صحیح ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ مولانا عبد الحکیم ۱۰۵۴ھ کے بعد شاہجہان کے دربار میں پہنچے ہیں۔ اسلئے کہ نواب سعد اللہ خاں رمضان ۱۰۵۰ھ میں معقول تنخواہ پر شاہجہان کے پاس ملازم ہوئے ہیں۔ اور چار ہی سال کے عرصہ میں قابلیت کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قلمدان وزارت بغیر کسی کوشش کے آپکے قبضہ میں آگیا ہے دربار میں پہنچنے کیلئے کسی ایسے تحفہ کی ضرورت تھی جو اِن کی قابلیت وعلمیت کا اظہار کرتی۔ شاعر نہیں تھے کہ قصیدہ لیجاتے۔ تاجر نہیں تھے کہ کوئی مال پیش کرتے مُخبر نہیں تھے کہ جھوٹی سچی خبروں سے اپنی مطلب براری میں کامیاب ہوجاتے۔ عالم تھے۔ علم کے کیڑے تھے۔ ہستی باری تعالی کے ثبوت میں ایک کتاب لکھی جو مختصر تھی لیکن نہایت مدلل اور جامع۔ نام اس کتاب کا دُرّ ثمینہ[۵۹] بیان کیا جاتا ہے۔ نواب سعد اللہ خاں کی معرفت شہنشاہ کے حضور میں وہ مختصر سی کتاب پیش کی۔ بادشاہ نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور وہ قدردانی اور علم نوازی فرمائی کہ چٹائیوں پر بیٹھنے والے سونے چاندی کے سکوں سے تولے گئے۔

ان روایتوں کی جب واقعات سے تطبیق کی جاتی ہے تو ہمیں ان کی صحت سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مولانا کے پاس ایک جنّ بشکل انسان پڑھتا رہا ہو۔ اسلئے کہ نہ عالم جنّات سے انکار ہے اور نہ اس بات سے کہ ان میں بھی بڑے

۵۹ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لار لاہور متوطن سیالکوٹ کا بیان ہے کہ عرصہ ہوا۔ اس مختصر سی کتاب کا میں نے ایک قلمی نسخہ کسی کے پاس دیکھا تھا۔

بھلے۔ نیک بد اور عالم و جاہل ہوتے ہیں۔ مگر مولانا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے جو مرتبہ علمائے عصر میں رکھتے تھے اور خود دربار جہانگیر میں جو ان کی وقعت تھی۔ وہ تعویذ دھاگہ۔ عامل و معمول اور افسوں اور ٹوٹکوں کی وجہ سے نہ تھی۔ مولانا لاہور کے سرکاری اعلیٰ مدرسہ کے صدر (پرنسپل) تھے۔ ملک میں ان کی عظمت و شہرت کا چرچا تھا۔ جہانگیر جب لاہور آتا تھا۔ تو مولانا ضرور دربار میں بلوائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ عالم فاضل تھے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ جاگیردار تھے شاہجہان ضرور اُن کے نام اور کام سے آگاہ تھا۔ تعارف کے لئے کسی جن یا عمل و افسوں کی ضرورت نہ تھی۔ جب شاہجہان نے بادشاہ ہو کر علماء و شعراء کی ایک فہرست انعام و اکرام عطا کرنے کیلئے مرتب کرائی تو مولانا کا نام بھی اس فہرست میں تھا۔ چنانچہ صاحب "آثار خیر" مُلا عبد الحمید لاہوری کے شاہجہان نامہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ جن علماء کو سال جلوس اوّل یا مابعد کے سالہائے جلوس میں انعام و اکرام ملتے رہے ہیں ان میں ایک مُلا عبد الحکیم فاضل سیالکوٹی بھی تھے۔ اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ انعام کی مقدار بارہ بارہ ہزار روپیہ ہوئی تھی۔

صاحب مآثر الکرام دفتر اوّل میں مولانا عبد الحکیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ "چوں نوبت دارائے ہندوستاں بہ صاحب قران شاہجہان انار اللہ برہانہ رسید۔ وظائف علماء و شعراء را رواجے دیگر پدید آمد۔ ملا عبد الحکیم درین عہد بارہا خود را بدرگاہ خلافت رسانید۔ ہرگاہ وارد حضور میگردید۔ بہ رعایت نقود بہ نامحدود مخصوص مے گشت و دوبار از سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت۔ وچند قریہ بہ رسم سیور غال انعام شد۔"

مندرجہ بالا سطور سے نہ صرف یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولانا عبد الحکیم کو دربار شاہجہان میں رسائی کیلئے کسی جن کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ انکا علم و فضل انکا کافی ذریعہ تھا۔ اور ان اوصاف کیوجہ سے بادشاہ ان کی بیحد قدر و منزلت کرتا تھا۔

---

لہ مُلا عبد الحمید لاہوری کو بھی چند مرتبہ انعامات ملے ہیں۔ ایک مرتبہ کے انعام کی رقم تین ہزار روپیہ بتائی گئی ہے +

دوسری وجہ نواب سعد اللہ خاں کی سفارش بتائی جاتی ہے۔ ہم اس پر بھی واقعات کے لحاظ سے ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

شاہجہان ۸ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ مطابق ۶ فروری ۱۶۲۸ء کو تخت پر بیٹھا ہے۔ نواب سعد اللہ خاں رمضان ۱۰۵۰ھ میں اس کے پاس آیا ہے۔ اور ۱۰۵۴ھ میں اسکو قلمدان وزارت ملا ہے۔ ہم "آثار خیر" "مآثر الکرام" اور "شاہجہان نامہ" کی تحریریں ہمکو بتا چکی ہیں کہ شاہجہان نے ابتدائے سلطنت ہی میں انعام و اکرام اور عطایات کے دروازے مولانا عبدالحکیم پر کھولدیئے تھے۔ ان تحریروں کی موجودگی میں یہ بات کسی طرح تسلیم نہیں کیجا سکتی کہ مولانا عبدالحکیم جو سعد اللہ خاں کے نواب اور وزیر ہونے سے ۱۶۔ ۱۷ سال پیشتر شاہجہان کے دربار میں رسوخ رکھتے تھے۔ سعد اللہ خاں کی سفارش سے شاہجہان کے دربار میں پہنچے ہوں۔ نواب سعد اللہ خاں کا عروج ۱۰۵۴ھ میں شروع ہوتا ہے۔ اور جمادی الآخر ۱۰۶۶ھ میں انکی وفات پر ۱۲ سال کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ مولانا عبدالحکیم نہ صرف ۱۰۳۷ھ ہی سے شاہجہان کے دربار میں رسوخ رکھتے تھے بلکہ شاہجہان کے باپ جہانگیر کے زمانہ میں بھی شاہی دربار میں ان کی آمدورفت تھی۔ جیسا کہ حضرت میاںمیرؒ کی ملاقات کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ دونوں عظیم القدر ہم مکتب کچھ مدت تک دربار شاہجہان کے نورتن رہے ہیں۔ نواب سعد اللہ خاں خوبیٔ قسمت اور اپنی اعلیٰ قابلیت سے وزیر ہو گئے۔ اور مولانا علمائے کرام کی صف میں اُس ممتاز جگہ پر بیٹھے جو بادشاہ کے پہلو میں نشست گاہِ علماء کے نام سے موسوم تھی۔

منطق و فلسفہ کی بحث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ نامی علماء و فضلاء دربار میں جمع تھے۔ وظیفے لیتے تھے۔ ان میں بعض درس و تدریس کا شوق بھی کرتے تھے یہ سب علماء جاگیروں کے مالک بھی تھے۔ اور سب "فاضل سیالکوٹی" کا ادب و احترام کرتے تھے۔ خود شہنشاہ نے کئی گاؤں جاگیر میں دیئے۔ اور ہمیشہ انعام اکرام سے

مالا مال کیا۔

شاہجہانی عہد میں جو نامور اور ذی علم علماء درجۂ امراء میں داخل تھے اور جن میں بعض (مثلاً نواب سعد اللہ خاںؓ) ملکی خدمات پر بھی مامور تھے۔ مصنف آثار خیر نے ان کی تعداد بائیس تک بیان کی ہے۔ جنمیں بدخشانی بھی ہیں۔ بخاری اور سندھی بھی ہیں۔ اور لاہور۔ کابل اور دہلی کے رہنے والے بھی ہیں۔ انہی میں "ملا عبد الحکیم سیالکوٹی" کا نام بھی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ یہ علماء و فضلاء ملکی کام بھی کرتے تھے۔ غیر ممالک کے بادشاہوں اور ماتحت والیانِ ملک کو حفظ مراتب کے ساتھ حکومت کی طرف سے مراسلے لکھتے تھے۔ شریعتِ اسلامیہ اور علمِ دین کی حفاظت۔ واشاعت کرتے تھے۔ ایسے ہی علمائے دین کے فیضان صحبت کا یہ اثر تھا کہ شاہجہان نے بادشاہ ہو کر کئی نامشروع امور مثلاً سجدہ۔ کورنش وغیرہ ترک کرا دیئے۔

روضۃ الادبا میں لکھا ہے کہ "فاضل سیالکوٹی" کچھ عرصہ تک شاہزادوں کو بھی تعلیم و تربیت دیتے رہے ہیں۔ اور جہانگیر اور شاہجہان آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔

شاہجہان علم کا بڑا حامی اور اہل علم کا بڑا قدر دان تھا۔ شاہجہان نامہ میں لکھا ہے کہ شاہجہان نے اپنے سال جلوس میں علماء فضلاء اور دیگر اربابِ استحقاق کو جو جاگیریں عطا کیں وہ ایکسو بیس ۱۲۰ گاؤں اور چار لاکھ بیگھہ زمین پر مشتمل تھیں۔ زر نقد جسکی تعداد لاکھوں تک ہوتی تھی۔ جاگیروں کے علاوہ ہوتا تھا۔

شاہجہان کی علم دوستی و علم پروری یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس نے اپنے ایام سلطنت میں تیرہ ۱۳ اہل کمال کو جنمیں دو ہندو۔ دو جراح اور باقی شعراء۔ مؤرخ اور علماء تھے سونے چاندی سے تلوایا۔

شاہجہان نے دو مرتبہ مولانا عبد الحکیم کا تلادان کرایا ہے۔ ماثر الامراء اور دیگر کتابوں میں لکھا ہے کہ مولانا کو دونوں مرتبہ چھ چھ ہزار روپیہ نقد ملا۔ جو انکے وزن کے برابر تھا

---

۵۔ روضۂ قیومیہ میں لکھا ہے۔ نواب سعد اللہ خاں علم و فضل میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے مگر کاروبار ملکی کی وجہ سے ان کے علم کا ظہور علماء کی مجلسوں میں نہیں ہوتا تھا۔

رائج الوقت ایک ہزار سکہ (ایک روپیہ کا وزن ایک تولہ کے برابر) کا وزن ساڑھے بارہ سیر ہے۔ چھ ہزار روپے کا وزن ایک من ۲۵ سیر ہے۔ اگر شاہجہانی سکہ کو موجودہ رائج الوقت (انگریزی) سکہ سے کم و بیش سمجھا جائے تو چھ ہزار روپے کا وزن پھر بھی دو من کے اندر ہی رہتا ہے۔ اس حساب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اچھی جسامت کے تھے۔ اور ان کی صحت باوجود کثرت مطالعہ اور شغلِ تدریس کے خراب نہ تھی۔

حدائق الحنفیہ میں مولانا عبدالحکیم کے حالات میں لکھا ہے کہ (بزمانہ شاہجہان) اِن کے پاس ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر تھی! جو آپ کی اولاد کے پاس چند پشتوں تک موجود رہی۔ مگر بعد میں گھٹتے گھٹتے بعہد سرکار انگلشیہ بالکل معدوم ہو گئی۔

## مولوی عبدالحکیم کے تلامذہ

مولوی عبدالحکیم علوم معقول و منقول منطق و فلسفہ اور دینیات کا وہ مجمع البحرین تھے کہ جن کے چشمۂ فیض سے سینکڑوں اور ہزاروں تشنگانِ علم نے پیاس بجھائی۔ لیکن آج جب مولانا کے فیض یافتگاں اور تلامذہ کے نام تلاش کئے جاتے ہیں تو سوائے ماثر الکرام جلد اوّل کے کہیں اور کسی جگہ کوئی نام نہیں ملتا۔

ماثر الکرام میں چونکہ زیادہ تر بلگرام (لکھنؤ) کے علماء و فضلاء کا ذکر ہے اسلئے اس میں مولانا کے جن دو شاگردوں کا نام ملتا ہے وہ بلگرام اور اسی نواح کے بزرگ ہیں اور ممکن ہے انہوں نے مولانا سے اس زمانہ میں تعلیم پائی ہو جب شاہجہان کے ابتدائی دور میں وہ لاہور سے اکبرآباد کے سرکاری مدرسہ میں بھیجے گئے تھے۔ کیونکہ اکبرآباد (آگرہ) بہ نسبت لاہور کے بلگرام اور اس کے نواحات سے بہت نزدیک ہے۔

مولانا نے لاہور اور سیالکوٹ میں بھی سرکاری اور پرائیویٹ طور پر سلسلۂ تدریس جاری رکھا ہے۔ جہاں دُور دُور سے لوگ پڑھنے کیلئے آتے تھے۔ اور چونکہ پنجاب کے گھر میں علم کی یہ گنگا بہ رہی تھی اسلئے اہل پنجاب کو یقیناً ان کی ذات سے فیضِ عظیم

پہنچا ہو گا۔ لیکن تعجب ہے کہ پنجاب میں ان کے کسی ایک شاگرد کا نام کسی تاریخ یا کسی کتاب میں جو راقم الحروف کے مطالعہ میں رہی ہے نظر سے نہیں گذر سکا۔

بہرحال مآثر الکرام سے جن دو شاگردوں کا پتہ مل سکا ہے اُن کا ذکر ذیل میں درج ہے۔

ملا عبدالرحیم ۔ مولوی صاحب سے عرصہ تک پڑھتے رہے۔ بعد فراغ تعلیم مراد آباد کے قاضی ہو گئے۔ وطن بھی سنبل (ضلع مراد آباد) کے قریب ہی تھا۔ سید سعد اللہ بلگرامی جن کا مزار گجرات (دکن) میں ہے اور جو فقر و فضل میں عالی مرتبت تھے انہی مُلا عبدالرحیم کے شاگرد تھے۔

میر سیّد اسمٰعیل بلگرامی ۔ ابتدائی علوم مُلا عبدالسّلام[۵۱] دیوہ (ضلع بارہ بنکی) سے حاصل کئے۔ ہندی علم موسیقی سے خوب واقف تھے۔ جب گرد و نواح سے پیاس بجھتی نظر نہ آئی تو مولوی عبدالحکیم کے پاس سیالکوٹ چلے آئے۔ جنکی شہرت ان کے ذاتی کمال علم اور شاہانہ نوازشوں سے دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔

سیّد بلگرامی نے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے سبق پڑھنے کیلئے علیحدہ وقت دیا جائے۔ مولوی صاحب نے عُذر کیا۔ اور فرمایا۔ ہجوم طلباء کے سبب علیحدہ وقت دینے کی گنجائش و فرصت نہیں ہے۔ مگر تم فلاں طالب علم کے ساتھ سماعت سبق اختیار کر سکتے ہو۔ میر صاحب نے اس خیال سے کہ وقت ضائع نہ ہو سماعت سبق کو قبول کیا۔ مگر اس طریق سے کہ سماعت کا پورا حق ادا کر دیا۔ یعنی جب انکا ساتھی طالب علم سبق لیتا تو آپ سُنتے رہتے اور مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ بولتے۔ گویا "سماعت" پر پورا عمل کر رہے تھے۔ اسی طرح ایک مدت گذر گئی۔ یہاں تک کہ خود مولوی صاحب نے ایکدن فرمایا کہ تم نے تو اتنے عرصہ میں کبھی ایک لفظ بھی اپنے مُنہ سے نہیں نکالا۔ میر صاحب نے

---

[۵۱] - مولوی عبدالسلام دیوہ اپنے ہمنام مُلا عبدالسلام لاہوری کے درس لاہور میں ایک عرصہ تک پڑھتے رہے۔ شاہجہان نے ان کو فوج کا قاضی بنا دیا تھا۔ لیکن آخر عمر میں اُنہوں نے استعفٰے دے دیا اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور میں انتقال فرمایا۔

کہا۔ مجھے سبق کے لئے علیحدہ وقت نہیں ملتا۔ اور دوسرے کے سبق میں سوائے سُننے اور خاموش رہنے کے میرا کوئی منصب بولنے کا نہیں ہے۔ اگر علیحدہ وقت فقیر کو عنائت ہو۔ تو اپنی استعداد کے اندازہ کے موافق کچھ حاصل کرسکونگا۔ ورنہ اسیطرح ناکام چلا جاؤنگا۔

مولوی صاحب نے فرمایا۔ عصر اور مغرب کے درمیان جو وقت ہے وہ میں تمہاری نذر کرتا ہوں۔ چنانچہ دوسرے دن میر صاحب کا درس مستقل طور پر علیحدہ شروع ہو گیا۔

ایکدن دوران سبق میں گفتگو اور بحث اس حد تک پہنچی کہ شام کی نماز کا وقت آگیا چنانچہ نماز پڑھکر پھر درس اور بحث میں مشغول ہو گئے۔ اور اس بحث نے اسقدر طول کھینچا کہ عشاء کی نماز تک گفتگو بحال رہی۔ مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ اس مسئلہ پر بڑی بحث ہو چکی ہے۔ اور ابھی سررشتۂ سخن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو فرمایا کل صبح اوّل وقت آؤ۔ تمام طلباء کا درس موقوف و بند کر کے سارا وقت اسی مسئلہ اور اسی بحث کو دیا جائیگا۔ دوسرے دن سیّد صاحب صبح ہی حاضر ہوئے۔ اور دوپہر تک بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ غرض تین دن تک اسی طرح بحث ہوتی رہی۔ لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا[ف۱] آخر مولوی صاحب نے سیّد صاحب سے کہا۔ آخر اس مقام کا حل تم پر بھی کسی طرح ظاہر ہوا ہے یا نہیں۔ میر صاحب نے کہا ایک محشی نے اس کا حاشیہ لکھا ہے۔ اور یہ کہکر میر صاحب نے جو حاشیہ خود لکھا تھا۔ نکال کر پیش کیا۔ مولویصاحب نے پڑھا۔ اور بے ساختہ ان کے ذہن رسا کی داد دی۔ اور تحسین کے جواہر نثار کئے۔ اور فرمایا۔ حاشیہ کا مطلب بہت دقیق اور نازک ہے۔ مگر عبارت طوالت سے خالی نہیں ہے۔ پوچھا۔ اب تک کہاں پڑھتے رہے؟ کہا۔ مُلا عبدالسلام صاحب دیوہ سے۔ مولوی صاحب کو خیال گذرا کہ مولوی عبدالسلام نے شائد میرا امتحان لینے کے لئے سیّد صاحب کو بھیجا ہے۔ اور اس خیال کو سیّد صاحب سے برملا ظاہر کر دیا۔ سیّد صاحب نے قسم کھائی کہ مولوی عبدالسلام کا اسمیں کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ محض بغرض استفادہ بطور خود حاضر خدمت ہوا ہوں۔

---

ف۱ - افسوس ہے کہ صاحب آثار الکرام نے اس مسئلہ کا نام نہیں لکھا۔ جسپر اسقدر طویل بحث جاری رہی منطق و فلسفہ کے خدا جانے کیا کیا نکات تھے جو زیر بحث رہے +

اس واقعہ کے بعد میر صاحب کی عزت مولانا کمال کے دل میں بہت زیادہ ہو گئی میر صاحب ایک عرصہ تک مولوی صاحب کے درس میں شامل رہے۔ اور بقیہ کتابوں کی تحصیل کر کے اور فاتحہ فراغ[۱] لیکر اپنے وطن کو واپس گئے۔

میر صاحب۔ صاحبِ قلم ہی نہیں تھے۔ بلکہ صاحب شمشیر بھی تھے۔ نواب نجابت خاں نے ایک مرتبہ آپ کی شجاعت دیکھکر کہا تھا "سید ما صاحب السیف و القلم است"۔ نواب نجابت خاں کے مصاحبوں میں تھے۔ آخر عمر میں ملازمت ترک کر دی۔ اور پھر مرتے دم تک تدریس و تصنیف کا شغل جاری رکھا۔ مولوی عبدالحکیم کے انتقال کے بیس سال بعد بعہد اورنگزیب عالمگیر سنہ ۱۰۸۸ھ میں اپنے وطن بلگرام میں پیوندِ خاک ہو گئے۔

---

## مولوی عبدالحکیم اور شیخ آدم بنوری

حضرت شیخ آدم بنوری[۲]۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بلکہ اپنے آپ کو تمام خلفاء سے افضل جانتے تھے۔ لاہور میں اُن کا ایک مخلص تھا۔ اُس نے شیخ صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ شیخ صاحب پانچ ہزار ارادتمند پٹھانوں کی ایک جماعت کے ساتھ سرہند کے رستے لاہور آئے۔ یہاں بے شمار لوگ آپ کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ بلکہ افغانستان سے صدہا آدمی آپ کی زیارت کیلئے لاہور آتے۔ جبتک آپ لاہور رہے۔ لاہور میں اسقدر رونق تھی کہ بقول صاحب روضۂ قیومیہ گلی کوچوں میں چلنا مشکل تھا۔

یہ واقعہ سنہ ۱۰۵۵ھ[۳] کا ہے جبکہ شاہجہان کشمیر سے واپسی کے وقت وسط رمضان[illegible]

---

۱۔ فاتحہ فراغ زمانہ قدیم میں ایک رسم تھی جسکا مطلب یہ تھا کہ جب طالب علم فارغ التحصیل ہو جاتا تھا تو استاد دیگر طلباء کے مجمع میں فارغ التحصیل طلبار کو چند نصیحتیں کرتا تھا۔ اور دعائے خیر کے بعد اُسکو رخصت کیا جاتا۔ ۲۔ بنور سرہند سے دس بارہ کوس کے فاصلہ پر ایک مقام ہے۔ ۳۔ مورخہ ۲۹ شوال کو نورجہاں نے لاہور میں انتقال کیا۔ شاہجہان اس وقت خود لاہور موجود تھا (باقی بر صفحہ آئندہ)

میں لاہور پہنچا تھا۔ اس سفر میں بادشاہ نے پانچ مہینے تک لاہور میں قیام کیا۔ اور ۱۴ صفر
کو یہاں سے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ جب بادشاہ نے سُنا کہ لاہور میں ایک ایسا
شیخ آیا ہے جس کے گرد ہزارہا لوگ جمع رہتے ہیں اور جس کے دم قدم سے لاہور میں
وہ رونق ہے کہ بازاروں اور گلی کوچوں میں چلنا محال ہو رہا ہے تو اس سے ملاقات
کرنے کیلئے وزیر سعید اللہ خاں سے مشورہ کیا۔ اسوقت مولوی عبدالحکیم کہ انکو ملک العلماء[۹]
بھی کہتے تھے موجود تھے۔ تجویز یہ قرار پائی کہ علامہ دستور المعظم اور ملک العلماء پہلے شیخ صاحب
سے جاکر ملیں۔ اگر شیخ صاحب میں کچھ جوہر نظر آئے تو پھر بادشاہ بھی اس سے ملاقات کرے
جب دونوں جلیل القدر عالم شیخ صاحب کے پاس آئے اسوقت شیخ خلوت
میں تھے۔ اُنہوں نے اطلاع کی مگر شیخ نے اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ آخر دونوں خلوتخانہ
سے باہر خانقاہ کے اندر بیٹھے رہے۔ کافی دیر کے بعد شیخ جب خلوت سے باہر نکلے پھر
بھی ان کی چنداں پرواہ نہ کی۔ ملک العلماء اور وزیر دونوں جیّد عالم تھے۔ کسی نہ کسی
طریق سے اُنہوں نے علمی مباحثہ شروع کر دیا۔ حضرت شیخ اوّل تو ان کی باتوں کو
سُنتے ہی نہ تھے۔ اور سُنتے بھی تھے تو جواب اور کا اور دیتے تھے۔
مولوی صاحب نے بحث ترک کر کے حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے بعض معارف
جو علم کلام کے متعلق تھے۔ اور حضرت کے چند اجتہادیہ مسائل کی تشریح شیخ صاحب سے
دریافت کی۔ شیخ نے حضرت مجدّد صاحب کے صرف دو تین تصرفات اور ان کے

---

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۳) بڑے اعزاز سے اسکو اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں جس کے گرد چار چمن تھے دفن
کیا۔ اسی سال پنجاب میں سخت قحط پڑا۔ امساک باراں اور افواج شاہی کی گرد آوری (تسخیر بلخ و بدخشاں) سے غلہ
اسقدر گراں ہو گیا کہ آدمی اپنے فرزندوں کو بیچتے ہی نہیں تھے بلکہ ذبح کر کے کھا جاتے تھے۔ بادشاہ نے متفرقات و مضافات
کے علاوہ لاہور میں دس لنگر خانے قائم کئے۔ ہر لنگر خانہ میں دو سو روپیہ کی خوراک پختہ و خام تقسیم ہوتی تھی۔ پچاس
ہزار روپیہ بے بضاعت سفید پوشوں کو دیا۔ اور حکم دیا کہ جو بچے فروخت کئے جا چکے ہیں ان کا زر سرکار سے
ادا کر کے وہ اپنے والدین کے پاس پہنچائے جائیں۔

۹؎ روضہ قیومیہ و دیگر خلفائے عظام و مریدان کرام حضرت مجدد الف ثانیؒ۔

بزرگانہ فضائل کا ذکر کر کے دقیق باتوں کا جواب کسی اور وقت پر ٹال دیا۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب نے ان حقائق و معارف کی تحقیق خود ہی بیان کی۔ جس پر تمام لوگ عش عش کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ شیخ صاحب! جہاں سے آپ کو یہ کمالات حاصل ہوئے ہیں میں نے بھی اسی بارگاہ سے کسب سلوک کیا ہے۔ میں تو آپ کو اپنی جنس (یعنی پیر بھائی) سمجھ کر آیا تھا۔ ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی۔

غرض مولوی صاحب اور وزیر سعد اللہ خاں دونوں وہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب تو خاموش رہے مگر وزیر نے کہا۔ یہ جاہل ہے پٹھان اس نے بہت جمع کر رکھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہیں فتنہ و فساد برپا کرے۔ بادشاہ نے شیخ کو کوئی تکلیف تو نہ دی۔ لیکن حج کے بہانے اُسے ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ چنانچہ شیخ آدم بنوری کا انتقال مدینہ ہی میں ہوا ہے۔

## مولوی عبد الحکیم اور حافظ شیخ حسین

شیخ حسین "ڈاڈا" قرآن شریف کا حافظ تھا۔ اور اپنے کمال علم کی وجہ سے آیات اللہ کے عجیب و غریب معانی بیان کرتا تھا۔ اس کا قول تھا۔ نہ مقیم ہوں نہ مسافر۔ نہ مسلمان نہ کافر الان کما کان (اب بھی ویسا ہی ہوں جیسا پہلے تھا) لاہور میں ڈاڑھی منڈا کر مست پھرتا تھا۔ اس کے سلسلے کے مرید بھی سب ڈاڑھی منڈے تھے۔ سماع و مزامیر اور گانے بجانے میں رات دن محو رہتا تھا۔ اس کے طریقہ ملامتیہ کی وجہ سے قاضی القضاۃ مخدوم الملک نے اسکو سزا دینی چاہی۔ مخدوم الملک ایکدن گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ شیخ نے اسکو دیکھ لیا۔ اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہنے لگا۔ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ توحید میں میں اور تم دونوں شریک۔ حج زکوٰۃ کو تم نے چھوڑا۔ نماز روزہ میں نے ترک کیا۔ پھر میں تمہارا کس طرح سزا کا مستحق ہوں؟ مخدوم الملک اسکا کچھ جواب نہ دے سکا اور چلا گیا۔ ایکدن مولانا عبد الحکیم بھی شیخ کے پاس گئے۔ اور کہا۔ میں مرید ہونا چاہتا ہوں۔ شیخ نے کہا۔ کیوں مجھے رسوا کرنا چاہتے ہو۔ تم اس کام کے نہیں ہو۔ اور نہ میری شرائط پوری کر سکتے ہو (یعنی تمہیں ڈاڑھی منڈانا ہوگی اور پیالہ (شراب کا) میرے ہاتھ سے پینا ہوگا) مولانا نے کہا اگر

۱۔ ... ملفوظات از تصنیف دارا شکوہ۔ سال تصنیف ربیع الاول ۱۰۷۱ھ

دلیل و برہان سے قائل کرلو گے تو جو کہو گے ماننے کو حاضر ہوں۔ شیخ نے کہا جاؤ تم خشک ملّا ہو میرے مطلب کے نہیں ہو۔ شہزادہ داراشکوہ نے حسنات العارفین میں شیخ کی اُن خوارق عادات اور کرامات کا ذکر کیا ہے جو مولانا کی چشم دید تھیں یا لوگوں نے بیان کی تھیں۔

## مولوی عبدالحکیم کا کتب خانہ

مولانا عبدالحکیم کے علم و فضل اور انکی علمی شہرت و قابلیت کے اندازہ سے ان کے نادر کتب خانہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ وہ خود مصنف تھے۔ صاحب علم تھے۔ طالب علم تھے۔ صاحب درس و تدریس تھے۔ کتابوں ہی میں پلے۔ کتابوں ہی میں پرورش پائی۔ امیر بلکہ امیر الامراء تھے۔ پھر کتابیں انبار در انبار ان کے پاس نہ ہوتیں تو اور کس کے پاس ہوتیں؟۔ خدا جانے منطق و فلسفہ۔ فقہ و حدیث۔ علم کلام و تفسیر اور نحو و الہیات کے کیا کچھ بیش بہا خزانے تھے۔ اور ان کے علاوہ کیا معلوم ہے کس کس علوم و فنون کا ذخیرہ تھا جس کا آج وجود تک بھی نہیں۔

افسوس خلف وہ نہ نکلے جو سلف تھے۔ سلف بنانے کیلئے آئے تھے خلف برباد کرنے کیلئے پیدا ہوئے۔ وہ کتب خانہ نا اہلوں کے پاس آ کر رفتہ رفتہ تباہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سکھوں کے زمانہ میں جب سیالکوٹ لوٹا گیا۔ شہر میں آگ لگائی گئی تو مولوی عبدالحکیم کا نادر کتب خانہ بھی جو اپنے زمانہ میں شمالی ہند کا لاجواب دار الکتب تھا سکھوں نے جلا دیا۔[۵۱]

## علّامہ عبدالحکیم کی وفات اور انکا مقبرہ

مولوی عبدالحکیم کے دو نامور ہم مکتبوں کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان میں عمر میں سب سے چھوٹے مگر شہرت و عظمت میں سب سے بالا و بزرگ تر حضرت مجدد الف ثانی رح سنہ ۱۰۳۴ھ میں کہ ابھی جہانگیر ہی کا عہد تھا۔ اور سعد اللہ خاں ابھی مُلا سعد اللہ لاہوری ہی کے نام سے مشہور تھا۔ انتقال فرما گئے۔

۵۱۔ اقتباس از خط شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور علّامہ عبدالحکیم میں جو علمی و روحانی بلکہ پیری و مریدی کے تعلقات تھے۔ وہ بعنوان "علّامہ عبدالحکیم کے ہم مکتب" ظاہر کیئے جا چکے ہیں۔ حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کی حسرتناک وفات سے جو رنج مولانا کو ہُوا ہو گا اس کا اندازہ ان تعلقات کی بنا پر خود ناظرین لگا سکتے ہیں۔

مولانا عبدالحکیم کے دوسرے ہم مکتب نواب سعد اللہ خاں تھے۔ جنہوں نے گیارہ سال کی وزارت عظمےٰ کے بعد بارہویں سال جمادی الآخر ۱۰۶۶ھ میں شاہجہان کی معزولی سے دو سال پیشتر انتقال کیا۔

۱۰۶۸ھ ۱۲ رمضان کو عالمگیر نے اپنے باپ اور مولانا عبدالحکیم کے حقیقی قدردان اور سرپرست شاہجہان کو قید و معزول کر کے بادشاہی تاج اپنے سر پر رکھا۔

علاوہ ازیں تین سلطنتوں کا انقلاب کچھ تھوڑی بات نہ تھا۔ اور پھر یہ وہ سلطنتیں تھیں جن کی مدت اکیسٹھ سال سے کم نہ تھی۔ اور جو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا سنہری عہد کہلاتی ہیں۔ جہانگیر کی اپنے باپ سے بغاوت! پھر اپنی بادشاہی کے زمانہ میں اس کے بیٹے خسرو کا فتنہ و فساد۔ اور آخر اس کا قید کی حالت ہی میں مر جانا۔ جہانگیر کی شاہجہان سے ناراضگی۔ اور کشمیر کے رستہ میں بادشاہ کا انتقال۔ شاہجہان کی تخت نشینی اور لاہور میں پانچ شہزادوں کا ایک ہی دن آصف جاہ کے ایماء سے قتل ہونا۔ پھر شاہجہان کی آخر عمر میں اُس کے چاروں بیٹوں کی باہم خانہ جنگیاں۔ بادشاہ کا قید ہونا۔ اور اس کے تینوں بیٹوں کا منجھلے بیٹے عالمگیر کے ہاتھوں قتل و آوارہ ہونا۔ یہ ایسی باتیں نہ تھیں کہ مولانا عبدالحکیم ان سے متاثر نہ ہوتے۔ اور پھر ۹۶۸ھ کی پیدائش کے مطابق ۱۰۶۸ھ میں جبکہ اُن کی عمر بھی ایک سو سال کی ہو چکی تھی۔ اور ان کے رفیق بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کا اپنا حال اِس شعر کے مطابق تھا ؎

ہوش و حواس و عقل و خرد جا چکے ہیں سب
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

مولانا عبدالحکیم کے سال پیدائش کا معیار صرف تاریخی قیاسات پر قائم کیا گیا ہے لیکن ان کے سال وفات ۱۰۶۸ھ میں سب مؤرخوں[۱] کا اتفاق ہے۔ مولانا عبدالحکیم

[۱] - دیکھو صفحہ ۲۳۸

اکبر کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اسی بادشاہ کے طویل زمانہ میں انہوں نے کمال علم مولانا کمال سے حاصل کیا۔ جہانگیر کے عہد میں دربار شاہی تک رسائی ہوئی۔ جہانگیر کی مصاحبت میں بیٹھے۔ جاگیر حاصل کی۔ شاہجہان کے وقت انتہائی ترقی حاصل کی۔ اور مختلف اوقات میں انکا تلا دان ہوتا رہا۔ تینوں بادشاہوں کا طویل عہد۔ اور اس عہد میں مولانا عبدالحکیم کی زندگی کا ثبوت اس بات کی علامت ہے کہ ان کی عمر اگر پورے ستو سال کی نہ بھی تھی۔ تو بھی اسقدر طویل ضرور تھی کہ اُنہوں نے متذکرہ صدر تینوں جلیل القدر بادشاہوں کے عہد حکومت دیکھے ہیں۔

تاریخ سیالکوٹ صمدی میں مولانا عبدالحکیم کی وفات کے دو تاریخی قطعات بھی نظر سے گذرے ہیں جو حسب ذیل ہیں :۔

بحکم ازل چوں بہ جنت رسید
ندائشد زدل سال ترحیل او

شہ معدنِ علم۔ عبدالحکیم
ولی مخزنِ علم۔ عبدالحکیم
۱۰۶۸ھ

دیگر

چو با حکمِ خدا داخل جناں شد
بخواں عارف بہشتی ارتحالش

حکیم آں عالمِ دیں با مروّت
دوبارہ متقی اھلالِ جنّت
۱۰۶۸ھ

وفات مولانا کی سیالکوٹ میں ہوئی۔ اور اپنے عالیشان باغ میں دفن کیے گئے۔ مولانا کے مزار کی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ سنگ مرمر اور دیگر اقسام کے بیش قیمت پتھر فرشوں۔ دیواروں۔ محرابوں اور قبر کے تعویذ پر لگائے گئے۔ تاریخ سیالکوٹ میں لکھا ہے اس طرز و شان کی عمارت سیالکوٹ میں بہت کم تھی۔

(صفحہ ۳۷ کا حاشیہ) ؎۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے۔ مولانا عبدالحکیم ۱۲۔ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو انتقال کر گئے۔ اس حساب سے ان کا انتقال شاہجہان کی نظر بندی و معزولی سے ۱۰ ماہ پہلے ہوا ہے۔ مگر باقی تمام تذکروں میں سال وفات ۱۰۶۸ھ درج ہے۔ اس لئے ہم نے بھی اسی سنہ کو زیادہ قابل وثوق قرار دیا ہے۔

مولانا کے تالاب اور سرکاری ہسپتال[۵۱] کے درمیان جو سڑک ہے اسکی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ کلو ڈال کے پتن کو جاتی ہے۔ دوسری وزیر آباد کو۔ دونوں شاخوں کے درمیان مولانا عبدالحکیم کے مقبرہ کی چار دیواری نظر آتی ہے۔ جس کے گرد و پیش بھی چند پرانی اور نئی قبروں کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

چار دیواری پختہ ہے مگر اس کس مپرسی میں دستبرد زمانہ سے وہ کب تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ قبر کا چبوترہ چھوٹی چھوٹی چند سیڑھیوں کے بعد آتا ہے۔ چبوترہ پر سفید پتھر کی چھوٹی چھوٹی تختیاں ہیں جن کی درزیں سنگِ سیاہ کے خطوط سے اب تک بھی نہایت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فرش کا یہ خوبصورت پتھر سنگریزے بن کر اب اکھڑتا جا رہا ہے۔

مولوی عبدالحکیم کی قبر کے پہلو میں ایک اور قبر ہے۔ تاریخ سیالکوٹ صمدی میں لکھا ہے کہ وہ قبر ان کے فرزند مولوی عبداللہ کی ہے۔ یہ دونوں قبریں بلند چبوترہ پر ہیں۔ ایک قبر ان کے سامنے ہی جنوب کی طرف واقعہ ہے۔ جو پختہ چونہ گچ بنی ہوئی ہے جس پر اوپر نیچے دو مصرعے لکھے ہوئے ہیں جنکے تمام حروف مٹ گئے ہیں۔ صرف آخری الفاظ دونوں مصرعوں کے "زیں عالم چرا" پڑھے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مصرعوں کی ردیف موجود ہے اور قافیہ اتنا تنگ ہوا ہے کہ مٹ گیا ہے۔

ان قبروں کے علاوہ اس احاطہ کے اندر چودہ پندرہ اور قبریں ہیں۔ جن میں سے کئی ایک درختوں کی جڑوں کے نیچے آکر بالکل منہدم ہو گئی ہیں۔

قبر بالکل بے سایہ ہے۔ سوائے چار دیواری کے کسی مکان یا عمارت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے سکھا شاہی دور میں جس طرح لاہور کی اسلامی عمارتوں پر زوال آیا ہے اسی طرح سیالکوٹ کی شاہجہانی طرز کی یہ عمارت بھی بے دردوں نے اسلامی جاہ و جلال کے آثار سمجھ کر یا سنگ مرمر کے طمع کیلئے مٹا دی ہو گی۔ لیکن جو لوگ اپنے نہ مٹنے والے کارناموں کی وجہ سے "ثبت است بر جریدۂ عالم" کا مصداق ہوں وہ جسمانی طور پر نابود ہو

[۵۱]۔ یہاں مولانا کا حمام و مسافر خانہ تھا جس کا ذکر مہودی صاحب کی تعمیرات کے ذکر میں آئیگا۔

جائیں - ان کی قبریں مٹا دی جائیں اور عمارتیں گرا دی جائیں - لیکن ان کے نام کبھی صفحۂ تاریخ سے مٹ سکتے ہیں؟ -

## مولانا عبدالحکیم کی اولاد و احفاد

تاریخوں میں مولوی عبدالحکیم کے صرف ایک ہی فرزند مولوی عبداللہ کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ مولوی عبداللہ جس قسم کے نامور اور بے عدیل باپ کے فرزند تھے ویسے ہی قابل اور حقیقی جانشین ثابت ہوئے -

تاریخ سیالکوٹ میں لکھا ہے - سیالکوٹ مولوی عبداللہ کے زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ نمونہ نظر آتا تھا - ان کا استفتاء تمام پنجاب میں جاری تھا - علوم ظاہری و باطنی میں ادراک کامل رکھتے تھے - "آثار خیر" میں لکھا ہے - مولوی عبداللہ عہد عالمگیری کے نامور اور مشہور علماء میں تھے - "مآثر الامراء" اور "روضۂ قیومیہ" میں جو عہد محمد شاہی کی تصانیف ہیں - آپ کے علم و فضل اور آپ کے اس رسوخ و اقتدار کا ذکر ہے جو عالمگیر کے دربار میں آپ کو حاصل تھا - روضۂ قیومیہ میں جو حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کے ایک قابل و عالم رکن مولانا خواجہ احسان احمد کی تصنیف ہے - لکھا ہے "آپ ہندوستان کے مشہور عالم تھے - آپ کی تصنیفات نہایت اعلیٰ پایہ کی ہیں" -

روضۂ قیومیہ میں آپ کو حضرت امام معصوم زمانی قیوم ثانی خلف حضرت امام مجدد الف ثانی کا ہمعصر بتایا گیا ہے - حضرت قیوم ثانی نے بعہد عالمگیر ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۰۷۹ھ تک بقید حیات تھے - نیز تمام تاریخوں میں آپ کو علمائے عالمگیری میں شامل کیا گیا ہے - عالمگیر کی وفات ۳۰ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ کو ہوئی ہے - آپ کا انتقال بھی اسی سنہ میں یا اس سے چند سال پیشتر ہوا ہوگا -

اس کے بعد اعظم شاہ سے لیکر رفیع الدولہ تک ہندوستان میں ۹ بادشاہوں نے[۲] دس سال ایک ماہ تیرہ یوم تک حکومت کی ہے - اس زمانہ میں مولوی عبدالحکیم کی اولاد

[۱] - دیکھو کتاب ہذا کا ضمیمہ "مشاہیر سیالکوٹ" دربیان مولوی عبداللہ۔ [۲] دیکھو صفحہ ۱۴۱

کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ روشن اختر محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ ؁ میں کشمیر کی تاریخیں ایک بزرگ مولانا جان محمد کا نام بتاتی ہیں جن کے متعلق لکھا ہے "۔ از احفاد ملا عبد الحکیم بود۔ و در علوم صوری از ملا عاقل استفادہ کردہ فاضل دوران شد۔ و بین الاقران ممتاز گشت"۔ شجرہ نسب میں لکھا ہے۔ مولوی جان محمد بن ملا ابو الفتح بن ملا فاضل۔ اس کے آگے سلسلہ درج نہیں ہے۔ شاید ملا فاضل۔ ملا عبد اللہ عالمگیری کے بیٹے ہوں جو ملک العلماء مولوی عبد الحکیم کے فرزند تھے۔

مولوی جان محمد اس خاندان کی یادگار تھے۔ علم و فضل جبکا کئی پشتوں سے ورثہ چلا آتا تھا۔ اسلیئے انہوں نے سن بلوغت سے پیشتر ہی مروجہ علوم میں کافی آگاہی حاصل کرلی تھی۔ زمانہ کی نیرنگیوں سے مجبور ہو کر وہ عین عالم شباب میں نادر شاہ کے غوغائی حملہ سے کچھ عرصہ پیشتر محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں دہلی پہنچے۔ ہر چند اس رنگیلے بادشاہ کے زمانہ میں ہر چیز یہاں تک کہ سلطنت بھی "دفتر بے معنی" سمجھکر "غرق مئے ناب اولی" ہو جاتی تھی۔ تاہم مولوی عبد الحکیم کے نام کی عزت و شہرت ابھی تک قائم تھی۔ بادشاہ نے کچھ مولوی عبد الحکیم کی عظمت کے لحاظ سے اور کچھ مولوی جان محمد کی ملاقات سے خوش ہو کر بارہ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کردیا۔ جو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نادر گردی کے زمانہ میں اور اس کے بعد زوال سلطنت کی وجہ سے ضبط ہو گیا۔

مولوی جان محمد بندش وظیفہ کے بعد کوہستان جموں و کشمیر کی طرف چلے گئے۔ اور سیاحت ہند کرتے ہوئے کابل جا پہنچے۔ جہاں اسوقت تیمور شاہ درانی ؁ کی حکومت تھی تیمور شاہ نے بڑی خاطر کی۔ اور معقول مشاہرہ مقرر کردیا۔ آپ تھوڑے دنوں کے بعد کابل سے کشمیر چلے آئے اور آخر عمر تک اسی جگہ تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ اور دوسری نگر میں

(حاشیہ صفحہ ۴۰) ؁۔ اعظم شاہ بن عالمگیر تین ماہ دس یوم۔ بہادر شاہ شاہ عالم بن عالمگیر پانچ سال ۸ یوم۔ معز الدین جہاندار شاہ بن بہادر شاہ گیارہ ماہ پانچ یوم۔ فرخ سیر بن عظیم الشان بن بہادر شاہ تین سال تین ماہ ۱۸ یوم۔ ابو البرکات بن رفیع الشان بن بہادر شاہ تین ماہ ۹ یوم۔ رفیع الدین بن رفیع الشان بن بہادر شاہ تین ماہ ۱۸ یوم۔ کل دس سال ایک ماہ تیرہ یوم۔ از ۱۲ ذی الحجہ ؁۱۱۱۸ھ لغایت ۱۷ ذیقعد ؁۱۱۳۱ھ۔

؁ و ؁ دیکھو صفحہ ۴۲۔

کہ کشمیر کا دار الخلافہ ہے وفات پائی۔

مولانا جان محمدؒ کے بیٹے کا نام مولوی محمد الدین تھا۔ سیاہ فام ہونیکی وجہ سے محمد الدین اسود کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ شیخ محمود تارہ بلی کاشمیری کے شاگرد تھے۔ پشاور جاکر تکمیل علوم کی۔ اور ایک عالم میں شہرت پذیر ہوئے۔ جب کشمیر واپس آئے تو ایام حیات درس وتدریس میں بسر کیئے۔ تاریخ کبیر کشمیر میں لکھا ہے بڑے پایہ کے عالم تھے۔ اپنے جدِ معظم مولوی عبد الحکیم سیالکوٹیؒ کی طرح اکثر کتب تحصیلی پر انہوں نے حاشئے لکھے ہیں۔ ۳۰ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو سری نگر میں انتقال فرما گئے۔

اسی تاریخ میں ایک اور نامور عالم مولوی قطب الدین کا ذکر الفاظ ذیل کے ساتھ آتا ہے۔ "مولوی قطب الدین فرزند مولوی محی الدین کشمیری وطناً سیالکوٹی کہ از اولاد مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی است در علم ظاہری فرد یکتا بود" مولوی قطب الدین "اوضح الدلائل" فی جواب خمسہ مسائل۔ "تحفۃ الہند" اور "ہلال عید" وغیرہ کتابوں کے مصنف تھے۔ شیخ احمد کاشمیری تارہ بلی کہ اپنے زمانہ کے نامور عالم فاضل اور واعظ بے بدل تھے۔ آپ کا اکثر بحث ومناظرہ رہتا تھا۔ کشمیر سے امرتسر چلے آئے وہیں انتقال کیا۔ اور مزار فتح بابا (بیرونِ شہر) میں مدفون ہوئے۔

ان کے معاصر شیخ احمد تارہ بلی کا انتقال ۱۲۹۰ھ میں ہوا ہے۔ اور مولوی قطب الدین کے ایک شاگرد مولوی احمد اللہ قاسمی نے ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مولوی قطب الدین بھی اسی زمانہ کے قریب ہوئے ہیں۔

۱۳۱۰ھ کے قریب مولوی عبد الحکیم کی اولاد سے مولوی غلام مصطفیٰ کے نام سے ایک بزرگ عالم سیالکوٹ محلہ میانہ پورہ میں گذرے ہیں۔ اُن کے بعد کشمیر اور سیالکوٹ میں مولوی عبد الحکیم کے خاندان میں جہاں منطق وفلسفہ کے چشمے بہتے تھے۔ بحث ومناظرہ سے معلومات علمیہ میں اضافہ ہوتا تھا۔ اور دل ودماغ روشن ہوتے تھے۔ ہُو کا عالم نظر آرہا ہے مولوی عبد الحکیم کی شہرت۔ اُن کے ذاتی کمالات۔ انکی ذاتی خوبیوں اور انکی اعلیٰ تصنیفات

(حاشیہ صفحہ ۴۱) ۱؎ عہد حکومت ۱۱۳۱ھ لغایت ۱۱۶۱ھ۔ ۲؎ ۱۱۸۹ھ لغایت ۱۲۰۷ھ۔

کی وجہ سے تھی۔ اس لیئے باوجود بڑے بڑے انقلابات کے ان کی علمی شہرت و عظمت اب تک قائم ہے ؂

رہتا ہے ذوق نام سخن سے ابد تلک — اولاد سے تو ہے یہی دو پُشت چار پُشت

مولانا کی اولاد کی دو شاخیں ہیں۔ ایک کشمیر میں اور ایک سیالکوٹ میں۔ شاخ سیالکوٹ کے قبضہ میں بقول صاحب تاریخ سیالکوٹ صرف ایک چاہ مقبرہ والا ہے۔ جس کے ساتھ دو تین گھماؤں اراضی ہے اور ایک دو آم کے درخت سرکار سے بطور معافی ملے ہوئے ہیں

## مولوی عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عمارتیں

شاہجہان کو تعمیر عمارات کا خاص شوق تھا۔ لاہور۔ آگرہ۔ دہلی۔ کشمیر اور دیگر مقامات پر اب تک عہد شاہجہانی کے کھنڈرات اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ یہ ٹوٹی پھوٹی دیواریں۔ یہ شکستہ عمارات عالیشان محلات و تعمیرات کا نشان ہیں ؂

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

بادشاہ کی دیکھا دیکھی امراء وزراء بھی عالیشان عمارتیں اور باغات تعمیر کرتے تھے۔ نواب سعداللہ خاں۔ نواب علی مردان خاں۔ نواب وزیر خاں کی اکثر تعمیرات لاہور۔ دہلی وغیرہ میں کسی نہ کسی حالت میں موجود ہیں۔ مولوی عبدالحکیم ہر چند طبقۂ علماء سے تھے لیکن حشمت و تموّل اور معقول جاگیر کی وجہ سے امرائے ذیشان کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے بھی اپنے وطن سیالکوٹ میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جن میں عالیشان ذاتی حویلی کے علاوہ بعض مکانات ایسے بھی تھے جو رفاہ عام کے لیئے وقف تھے۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

مسجد و مدرسہ مولوی عبدالحکیم۔ یہ عالیشان مسجد بعمارت پختہ اب تک موجود ہے۔ اسی میں مولانا عبدالحکیم کا مشہور مدرسہ بھی تھا۔ جسکی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اسی مدرسہ سے صدہا طالب علم دستارِ فضیلت لیکر اور فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے۔ اُس زمانہ میں علم بیچا نہیں جاتا تھا۔ اور نہ علم فروشی اور فیس و تنخواہ لینے کی وجہ سے اُستاد اپنے شاگرد کی نظروں میں اسقدر حقیر سمجھا جاتا تھا۔ مولانا کے مدرسہ میں نادار طلبائے سیالکوٹ کے علاوہ

بیرونجات کے مستحق طلباء کو بھی کپڑے۔ کتابیں اور کھانا دارالاقامہ سے ملتا تھا۔

مسجد کے محراب کے اندر حسب ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے:-

تاریخ ہذا۔ اَلْمَسْجِدُ مِنْ بَانِیْہٖ ۔ لَہُ الْبَیْتُ فِی الْجَنَّۃ

دُوسرے نقرہ سے بنائے مسجد کا سال ۱۰۵۲ھ نکلتا ہے۔ چونکہ مسجد کے ساتھ ہی مدرسہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سنہ میں آپ نے سیالکوٹ میں اپنا درس بھی جاری کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کا ایک ہم مکتب سعد اللہ خاں بڑھتی دولت کی طرح شاہجہان کے دربار میں عروج حاصل کر رہا تھا۔ اور ابھی وزارت عظمےٰ کا عہدہ اس کو نہیں ملا تھا۔

بنائے مسجد کی یہ تاریخ ہمیں ایک اور واقعہ کا پتہ بھی دیتی ہے۔ یعنی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے لاہور اور آگرہ کی سرکاری ملازمت ۱۰۵۲ھ سے پہلے ہی ترک کر دی تھی۔ اسلئے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب انہوں نے اپنا درس جاری کر دیا ہے تو پھر سیالکوٹ سے بہت کم باہر نکلے ہیں۔ البتہ جاگیردار یا علمائے دربار کا رکن بلکہ ملک العلماء ہونیکی وجہ سے بادشاہ کی دعوت پر کبھی دہلی اور کبھی لاہور تک چلے جاتے تھے۔

مسجد کی کچھ زمین دروازہ مسجد کے باہر عرصہ دراز سے سفید پڑی ہوئی تھی۔ ایک خیر مجسم بزرگ مستری قادر بخش[1] مرحوم کاشمیری نے کمیٹی سے خرید کر مسجد کے نام وقف کر دی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں یہ زمین صحن مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کی گئی[2]۔ صحن میں ایک فوارہ دار حوض تیار ہوا ہے جو پانی سے لبریز رہتا ہے۔ یہ مسجد محلہ میانہ پورہ میں واقع ہے۔ اسی محلہ میں مولانا عبد الحکیم کے رہائشی مکانات بھی تھے۔ جن میں سے اب کسی کا نشان تک بھی نہیں ہے۔ میانہ پنجابی زبان میں مسجد کے مُلّا کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہاں مدرسہ

---

[1] - مولوی محمد ابراہیم صاحب میر۔ سیالکوٹی کے والد۔

[2] - مولوی عبد الحکیم صاحب محافظ دفتر ضلع سیالکوٹ (سکنہ نارووال) نے جو اس مسجد میں نماز جمعہ بھی پڑھاتے ہیں۔ عام چندہ سے مسجد کو بارونق بنایا ہے۔ سُنا ہے آپ مسجد میں درس بھی دیتے ہیں۔

اور مولانا کی رہائش کی وجہ سے اکثر طالبانِ علم اور درویش اور مُلّا لوگ رہتے تھے اس لئے اِس جگہ کا نام ہی میانہ پورہ مشہور ہو گیا۔ اور یہ نام مولانا عبدالحکیم کے زمانہ ہی سے چلا آتا ہے۔

**حمام و مسافر خانہ مولوی صاحب۔** تالاب (جسکا ذکر آگے آتا ہے) کے متصل ہی مولوی عبدالحکیم نے ایک حمام اور مسافر خانہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ عالیشان عمارتیں جو سیالکوٹ کی عظمت و شہرت کا باعث تھیں۔ "در و دیوار شکستہ" کی صورت میں اُبتدائے عہد انگریزی تک موجود تھیں۔ ۱۲۷۵ھ میں جسکو آج ۱۳۴۱ھ میں چھیاسٹھ سال کا عرصہ ہوتا ہے سرکار انگریزی نے دیواریں گرا کر اس جگہ شفاخانہ یعنی خیراتی ہسپتال بنا دیا ہے۔

**باغ مولوی صاحب۔** تالاب سے مغرب کی جانب مولوی عبدالحکیم نے ایک وسیع اور دلکشا باغ تعمیر کرایا۔ جس کے چاروں طرف ایک بلند فصیل بعمارت پختہ باغ کی حفاظت کے لئے بنوائی گئی۔ باغ میں ہر قسم کے اشجار ثمردار موجود تھے۔ سیر و سیاحت کی تو ہر ایک کو اجازت تھی مگر اثمار شیریں و لذیذ سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے جو مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ یا مسافر خانہ میں عارضی طور پر قیام کرتے تھے۔

اللہ اکبر۔ کیا زمانہ تھا۔ کیا دن تھے۔ باغ میں نہریں چل رہی ہونگی۔ ہر کیاری پھولوں سے لدی ہو گی۔ مولانا طالب علموں کے جھرمٹ کے ساتھ باغ میں آتے ہونگے اور باغ باغ ہوتے ہونگے۔ باغ کی چاردیواری کے اندر نشست گاہیں ہونگی۔ چبوترے ہونگے بارہ دریاں ہونگی۔ انہیں سنگ مرمر۔ سنگِ سیاہ۔ سنگِ زرد۔ سنگِ ابری اپنی اپنی بہار دکھاتے ہونگے۔ افسوس اب نہ باغ ہے نہ فصیل۔ نہ کوئی بارہ دری نہ عمارت ع

ہر روش خاک اڑاتی ہے صبا میرے بعد

راقم الحروف ۱۹۲۰ء میں وہاں گیا۔ ایکدو آموں کے درخت نظر آئے۔ ایک کنوآں جاری تھا۔ اور اس کے ساتھ کچھ مزروعہ اراضی تھی۔ اِسی جگہ مولانا کی قبر بھی ہے۔ پُوچھا مولانا کا باغ کہاں ہے؟ جواب مِلا! یہی باغ ہے جہاں تم کھڑے ہو۔ اور جہاں کھیت نظر آرہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

**عیدگاہ مولوی صاحب** ۔ مولوی عبدالحکیم نے ایک عالیشان اور وسیع عیدگاہ تعمیر کرائی ۔ جس کے چاروں طرف بلند اور چونہ گچ عمارت تھی ۔ عیدگاہ کا دروازہ اور اس کی پیشانی اُسی قسم کے نقش ونگار اور خوبصورت بیل بوٹوں سے آراستہ تھی جسطرح لاہور کی مسجد وزیر خاں اور گلابی باغ اور باغ چوبرجی کے دروازوں کی پیشانیاں اب تک منقش نظر آرہی ہیں ۔ عیدگاہ کے چاروں دروازوں پر نہایت بلند مینار تھے ۔ عیدگاہ کا صحن اسقدر وسیع تھا کہ اسمیں ہزارہا آدمی بہ آسانی نماز پڑھ سکتے تھے ۔

بمرور ایام ۔ دیوار اکثر جگہ سے شکستہ ہوگئی ۔ ۱۲۸۷ھ میں سید وزیر علی ڈپٹی اور میر اسد علی سیالکوٹ میں نائب تحصیلدار تھے ۔ اونہوں نے کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ شہر کے مسلمانوں سے لیا ۔ اور عیدگاہ کی مرمت کرادی جو ہزار غنیمت سمجھی جاتی ہے ۔

**تالاب مولوی صاحب** ۔ مولوی عبدالحکیم غربا کی مدد کئی طریقوں سے کرتے تھے ۔ طالب علموں کا خرچ برداشت کر کے علم جیسی انمول نعمت ان کو بلاقیمت دینا یہ بھی ایک طرح کی بیش قیمت مدد تھی ۔ قابل مدد شرفاء کو نقد و جنس کی اعانت سے مالامال کرتے تھے ۔ جب قحط پڑتا تھا اور مفلوک الحالوں کی تعداد حد و حساب سے زیادہ ہوجاتی تھی ۔ تو اُن کی مدد معاش کے لئے تعمیرات کا کام جاری کر دیتے تھے ۔ چنانچہ ان کی بہت سی تعمیرات اُن کی فیاضیوں ۔ سیر چشمیوں اور غربا پروریوں کا ایک بہانہ تھیں ۔ انہی میں ان کا وسیع و عمیق اور عالیشان تالاب بھی ہے جو مسجد سے کچھ فاصلہ پر ہے اور جس سے آجتک اہل شہر مستفیض ہو رہے ہیں ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تالاب لاکھوں روپیہ کی لاگت سے بنا تھا ۔ اسمیں دریائے چناب سے ایک نہر آتی تھی ۔ جس کے مٹے ہوئے نشان اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ۔

مولانا کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب سکھا شاہی دور آیا ۔ تو تالاب کی ملحقہ عمارتیں اور بُرجیاں اور پل مسمار ہو کر زمین کے برابر ہو گئے ۔

غدر ۱۸۵۷ء کی شورش میں ہندوستان کے ہر مشہور شہر کو کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا ۔ چھاؤنی سیالکوٹ میں بھی ہل چل اور لوٹ مچی ۔ مگر پھر بھی بہت بچاؤ رہا ۔ البتہ مولوی عبدالحکیم

کے تالاب کی سُنی گئی - جو برسوں سے مسمار و ویران چلا آتا تھا۔

چھاؤنی کے لٹ جانیکی وجہ سے سرکار انگریزی نے بطور سیاست اہل سیالکوٹ پر پچاس ساٹھ ہزار روپیہ جرمانہ کیا جو وصول کر کے داخل خزانہ کیا گیا۔ لیکن جب بعد میں سرکار کو معلوم ہُوا کہ فتنہ انگیز اور شورش پسند معدودے چند تھے۔ تمام شہر وفادار اور خیر سگال رہا ہے۔ تو حکم ہوا کہ جرمانہ واپس کر دیا جائے۔ اُس زمانہ میں ڈپٹی میر قائم علی[۵۱] سیالکوٹ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اونہوں نے شہر کے معززین اور چوہدریوں کو سمجھایا۔ کہ اگر تم یہ رقم واپس لے لو گے۔ تو کسی کو دو ملیں گے۔ کسی کو چار۔ کسی کو دس۔ اور یہ سب قریباً بیکار جائیں گے۔ لیکن اگر اس روپیہ سے مولوی صاحب والے تالاب کی صفائی اور مرمت کرا دی جائے تو اس چشمۂ فیض سے سیالکوٹ کے سب لوگ بلا تمیز مذہب وملت مستفیض ہو سکتے ہیں۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور غدر ۵۷ء کا جرمانہ تالاب کی کھدائی اور مرمت پر خرچ کیا گیا۔ تالاب کے درمیان ایک کنوآں تھا۔ اور وہاں تک ایک پختہ پُل بنا ہوا تھا۔ مگر مرمت کے وقت وہ پُل نکال کر کنوآں بند کر دیا گیا۔ تالاب چونکہ شہر سے بالکل ملحق ہے اسلیئے سارا دن وہاں عورتوں اور مردوں کا ہجوم رہتا ہے۔ تالاب کی غربی جانب میونسپل کمیٹی نے مستورات کے لیئے ایک پردہ دار گھاٹ بنا دیا ہے۔

---

[۵۱] میر عبد الباقر صاحب کوہاٹ اور میر فیض العسکری صاحب پنشنر ڈپٹی سرگودہا آپ ہی کے پوتے ہیں۔

# مولوی عبدالحکیم اور علماء و مشائخ اور مؤرخین

مولوی عبدالحکیم کا پایۂ علم و فضل میں کس قدر بلند تھا۔ اور ان کی علمی شہرت اور علمی زندگی ہندوستان کے علماء و مشائخ اور مؤرخین میں کس عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اس کے متعلق ہم کو چند تاریخوں کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔

مولانا ابوالفیض کمال الدین شیخ محمد احسان مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی عبدالحکیم کی وفات کے قریباً ایک سو سال بعد روضۃ القیومیہ نام ایک کتاب ۱۱۶۴ھ کے قریب لکھی ہے۔ جسمیں حضرت مجدد الف ثانی قیوم اوّل اور ان کے صاحبزادہ امام محمد معصوم قیوم ثانی اور باقی دونوں حضرات قیوم ثالث و قیوم رابع کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ اور وہ خود بھی چونکہ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے ہیں۔ اسلئے وہ کتاب نہایت معتبر سمجھی جاتی ہے۔ مولانا ابوالفیض روضۂ قیومیہ میں مولانا عبدالحکیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ "مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی علمائے وقت کے بادشاہ اور تصانیف عالیہ کے مالک تھے۔ انہوں نے ہر علم میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور تصنیف کی ہے۔ جسے طالب علم تحصیل علم کے آخری درجہ میں پڑھتے ہیں۔ اور انہوں نے ہر ایک کتاب پر حاشیہ لکھا اور شرح کی ہے۔ جس سے طلباء فوائد کثیرہ حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ آپ کی شرح اور حواشی بغیر وہ کتاب حل ہی نہیں ہو سکتی۔"

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی جو خود بھی ایک عالم اجل۔ فاضل یکتا۔ مؤرخ بے نظیر اور اہل اللہ بزرگ محمد شاہ بادشاہ غازی کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔ اپنی کتاب مآثر الکرام کے طبقۂ علماء میں مولانا عبدالحکیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ "علامۂ زمان و افتخار زمانیاں ہست۔ الحق در جمیع فنونِ درسی مثل او از زمین ہند نہ برخاست۔" اسی قسم کے خیالات میر غلام آزاد بلگرامی نے اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان میں ظاہر کیے ہیں۔ تاریخ سیالکوٹ صمدی کا مصنف لکھتا ہے۔ "اکابر علماء و فضلاء میں ان کا شمار تھا۔ علم کے بحر مواج اور خدا پرستی و دین پروری کے سراج تھے۔" مولوی محمد الدین لاہوری مولوی فاضل کہ اکثر عربی۔

فارسی اور اردو کُتب کے مصنف اور لاہور کے ممتاز علماء میں درجۂ اختصاص رکھتے ہیں۔ روضۃ الادباء میں لکھتے ہیں۔ "مولانا عبدالحکیم علوم عقلیہ و نقلیہ میں یگانۂ زمان اور فہامۂ دوران ہوئے ہیں۔ سیالکوٹ انکا وطن تھا۔ اِس لئے فاضل سیالکوٹی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور چونکہ سیالکوٹ اُس زمانہ میں ضلع لاہور تھا۔ اور مولانا لاہور کے شاہی مدرسہ میں بھی تعلیم دیتے رہے تھے۔ اس لئے فاضل لاہوری کے نام سے بھی مشہور ہو گئے۔" آثار خیر کے مصنف لکھتے ہیں۔ "ہندوستان کے مشہور علماء فضلاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔" تاریخ بند وبست سیالکوٹ کے ہندو مصنف ڈپٹی امین چند لکھتے ہیں۔ "یہ شخص بڑا عالم فاضل ہو گذرا ہے جسکی تصنیفات میں سے کئی کتابیں زبان عربی میں موجود ہیں۔"

مولانا محمد ہاشم جو مولانا عبدالحکیم کے ہم مکتب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ارشد مُریدوں میں تھے۔ اپنی کتاب زبدۃ المقامات میں مولانا کے متعلق اپنے وقت کے شیخ المشائخ۔ پیر طریقت۔ واقف رموز شریعت حضرت مجدد الف ثانی رح کے الفاظ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ "مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ علوم عقلیہ و نقلیہ میں تصانیف عالیہ رکھتے ہیں۔ اِس وقت دیارِ ہند میں ان کا کوئی نظیر نہیں ہے۔" حدائق الحنفیہ میں مولانا فقیر محمد جہلمی آپکے تذکرہ کے دوران میں لکھتے ہیں۔ "بڑے عالم فاضل فقیہہ محدث مفسر خصوصاً علم معقولات میں طاق۔ یگانۂ آفاق۔ اور صاحب تصانیف عالیہ تھے۔ آپکے فتاوے پر علمائے ہند و پنجاب سے کسی کو چون و چرا کی طاقت نہ ہوتی تھی۔"

اکبری۔ جہانگیری اور شاہجہانی عہد میں جسقدر علماء و صوفیا ناہور ذی علم اور اہل کمال گذرے ہیں۔ سب آپ کا ادب و احترام کرتے تھے۔ اس وجہ سے نہیں کہ آپ اُستاد الجن تھے۔ بلکہ محض اِس لئے کہ ایک عالم کی دوات کی سیاہی ایک شہید کے خون کے قطرہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپکی علمی شہرت و عظمت کے آگے تمام علماء کی گردنیں خم تھیں۔ اور خود شاہانِ عصر بھی آپ کی اور آپکے سینے میں جو گنج علم فراواں تھا

اُس کی توقیر کرتے تھے۔

تمام تذکروں اور تاریخوں میں علامہ عبدالحکیم کا ذکر مُلا عبدالحکیم کے نام سے درج ہے۔ ہم نے بھی اس کتاب میں کہیں کہیں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اِسلئے اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اُس زمانہ میں مُلا اُن ملانوں کو نہیں کہتے تھے جو آجکل مسجدوں میں نظر آرہے ہیں اور جن کو اہل محلہ اپنا غلام سمجھ رہے ہیں۔ مُلا۔ در حقیقت انتہائے علم کے ایک درجہ کا نام تھا۔ مُلا عبدالقادر بدایونی اور مُلا ابوالفضل کو جانتے ہو۔ جن میں پہلا نہ صرف اکبر کا امام تھا بلکہ اُس عہد کا بے خوف و بے باک مؤرخ تھا۔ دوسرا اکبر جیسے شہنشاہ کا وزیر اعظم تھا۔ نواب سعداللہ خاں اپنی ملازمت شاہجہانی کے ابتدائی ایام میں مُلا سعداللہ لاہوری کے نام سے مشہور تھا۔ علامہ عبدالحکیم کے اُستاد مولانا کمال کو بھی اکثر کتابوں میں مُلا کمال لکھا ہے۔ یہ اِس قسم کے مُلا تھے جن کے مقدس ناموں پر جن کے کمال علم و فضل پر۔ جن کی اعلیٰ تصنیفات پر آج مسلمانانِ ہند کو فخر و ناز ہے۔

---

# مولوی عبدالحکیم کی تصنیفات

مولوی عبدالحکیم کی تصانیف کی صحیح اور مکمل تعداد کسی تاریخ سے معلوم نہیں ہوسکی اُنہوں نے زیادہ تر منطق و فلسفہ کی ادق ترین عربی کتابوں کے حاشئے اور ان کی شرحیں لکھی ہیں۔ صرف ایک کتاب غنیۃ الطالبین ایسی بتائی جاتی ہے جس کو آپ نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ باقی آپ کی تمام تصانیف۔ حاشیے اور شرحیں عربی زبان میں ہیں۔

مآثر الکرام میں آپ کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے۔ "تصانیف اُو در بلاد عرب و عجم سائر و دائر ست"۔ صاحب روضۃ الادباء لکھتے ہیں۔ "تصنیفات آپ کی بہت مفید ہیں۔ اور اہل علم ان کو بہت پسند کرتے ہیں"۔ چنانچہ آپ نے خیالی کا جو حاشیہ لکھا ہے۔ اس کے متعلق کسی کا یہ شعر مشہور ہے ؎

خیالات خیالی بس عظیم است    برلئے حل او عبد الحکیم است

علاوہ ازیں تفسیر بیضاوی۔ مطوّل پر حاشیہ اور عبد الغفور کا تکملہ آپ نے نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔

مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے آپ کی تصانیف کی جو تعداد معلوم ہوسکی ہے ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے:۔

(۱) حاشیۂ تفسیر بیضاوی۔ (۲) حاشیۂ مطوّل (۳) حاشیۂ عبد الغفور[۱] (۴) حاشیۂ شرح مطالع (۵) حاشیۂ شرح مواقف (۶) حاشیۂ مقدمات تلویح (۷) حاشیۂ شرح عقائد تفتازانی (۸) حاشیۂ حاشیۂ خیالی[۲] (۹) حاشیۂ شرح شمسیہ و قطبی میر۔

[۱] مولانا عبد الغفور لاری مولانا عبد الرحمٰن جامی کے مرید تھے۔ اور ایسے کامل مرید تھے کہ حضرت کا ان کے متعلق قول تھا کہ "ایک ہی مرید عبد الغفور لاری ہزار مریدوں سے بہتر ہے"۔ آپ کے حق میں مولانا جامی اکثر یہ شعر فرمایا کرتے تھے ؎ آنجا کہ فہم و دانش مرغے بود شکاری ÷ باز سے ست تیز رفتار عبد الغفور لاری۔ شرح مُلا اور نفحات الانس کے آپ نے حاشیے لکھے۔ شرح مُلا کا صرف بحث مفروات تک ہی حاشیے لکھنے پائے تھے کہ انتقال ہوگیا۔ آخر مولوی عبد الحکیم نے اس کا تکملہ اس تطبیق کے ساتھ تصنیف کیا کہ ہرگز تمیز نہیں ہوسکتی کہ مولانا عبد الغفور نے حاشیہ کہاں تک لکھا ہے۔ اور مولانا عبد الحکیم نے کہاں سے شروع کیا ہے۔ مولانا عبد الغفور کا ۵ شعبان بروز یکشنبہ ۹۱۲ھ کو انتقال ہوگیا۔

[۲] اصل نام احمد بن موسیٰ البشیر بالخیالی۔ شمس الدین لقب تھا۔ ابتدائی علوم اپنے باپ سے پڑھے پھر مولیٰ خضر بیگ سے استفادہ کر کے شہر بروصہ کے مدرسہ سلطانیہ کے مدرس ہوئے۔ وزیر محمود پاشا نے سلطان محمد خاں فرمانروائے ٹرکی سے آپ کے صاحب کمال ہونیکا ذکر کیا۔ اور کہا کہ ان کو مدرسے زنیق میں مدرس اعلیٰ مقرر کر دیا جائے۔ تو انسب ہوگا۔ خلیفہ نے کہا۔ خیالی وہ شخص تو نہیں ہے جس نے شرح عقائد پر حواشی لکھے ہیں۔ وزیر نے کہا۔ ہاں وہی خیالی ہے۔ خلیفہ نے فرمایا۔ بیشک ایسی اعلیٰ اور اچھی جگہ ایسے ہی قابل کو ملنی چاہیئے۔ وزیر نے خیالی کو اس خوشخبری سے اطلاع دی۔ اس نے کہلا بھیجا۔ میں حج کا ارادہ کر چکا ہوں۔ بشرط خیریت واپس آنے کے بعد اس مدرسہ کی خدمات انجام دونگا وزیر نے کہا۔ پھر موقع نکل جائے گا۔ خیالی نے جواب دیا۔ اگر وزیر اپنی فیاضی (بقایا دیکھو صفحہ ۵۲)

(۱۰) تکملہ عبدالحکیم شرح جامی (۱۱) حاشیہ شرح مطالع (۱۲) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی (۱۳) درۂ ثمینیہ در ثبات واجب الوجود (۱۴) حواشی در کنار شرح حکمۃ العین (۱۵) حواشی در کنار شرح ہدایہ حکمت (۱۶) حواشی در کنار شرح الارواح (۱۷) ترجمہ غنیۃ الطالبین تصنیف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (عربی سے فارسی میں) (۱۸) شرح تہذیب محشی۔ اسکی شرح مفتی عبداللہ و شیخ الاسلام نے بھی لکھی ہے۔ لیکن مولوی عبدالحکیم نے جو شرح لکھی ہے اس کو سب پر فوقیت ہے (۱۹) القول المحیط۔ یہ رسالہ تحقیق جعل مؤلف اور جعل بسیط علم منطق میں ہے (۲۰) کتاب مشہور (۲۱) دلائل التجدید (حضرت مجدد الف ثانی کے دعوے کی تائید میں) (۲۲) سیالکوتی التصورات (علم منطق میں)

مولوی عبدالحکیم نے جو شرحیں لکھیں اور جو حواشی مختلف ادق کتابوں کے تحریر کیئے۔ اُنہوں نے آپ کی شہرت و عظمت کو علماء عصر میں ممتاز جگہ دی۔ مگر اس زمانہ میں ایسے علماء بھی موجود تھے جنکو آپ کے خیالات سے اختلاف تھا۔ علم کلام۔ علم نحو اور فلسفہ و البیان میں جو کچھ آپ لکھتے تھے۔ علماء اس کو تسلیم کرنے پہ مجبور نہیں تھے۔ مولانا اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرتے اور لکھتے تھے۔ اور دیگر علماء بھی ان سے اختلاف کرتے تھیں

(بقایا حاشیہ صفحہ ۵۱) اور سلطان اپنی سلطنت بھی دیدے تو بھی اپنے اس مبارک ارادہ کو ترک نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حج سے واپس آنے کے بعد وہ اسی مدرسہ کے مدرس ہوئے۔ پھر ۳۲ سال کہ عین جوانی کا عالم تھا۔ ۸۳۰ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ بڑے نحیف البدن تھے۔ رات دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتے۔ اور ہمیشہ علم و عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ شرح عقائد نفسی پر آپنے نہایت قابلانہ مگر مختصر حواشی تحریر کیے ہیں جو متداول بین الدرس والتدریس ہیں۔ لیکن بعض مواقع پر اس دقت کو کام فرمایا ہے کہ بڑے بڑے علماء اس کے حل کرنے میں حیران رہجاتے ہیں۔ اسلئے ان حواشی کا حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے ایسا عمدہ لکھا کہ تمام مشکلات و مفصلات کو حل کر کے طلباء کیلئے آسان کر دیا۔ آپ کے ایک شاگرد اسمعیل بن بالی قرامانی (کمال الدین لقب المعروف قرہ کمال وفات ۹۳۰ھ) نے بھی آپ کے حاشیہ شرح عقائد کی شرح ۹۲۹ھ میں لکھی۔ لیکن مولانا عبدالحکیم کی شرح جب مشہور ہوئی تو اس کا فروغ جاتا رہا +

پوری جرأت و بے باکی سے کام لیتے تھے۔

ملا عبدالرزاق بانڈے کشمیر کے جلیل القدر عالم سے مولفات میں بے نظیر تھے شرح تجرید کا حاشیہ لکھا تو شاہجہان نے ازراہ قدردانی مدرسہ کابل کا مدرس مقرر کر کے افغانستان بھجوایا۔ کتاب محاکمات کا رد لکھتے لکھتے دماغ میں خلل آگیا۔ اور اپنے آپ کو زخمی کر دیا۔ آخر عمر میں کشمیر چلے آئے۔ اور وہیں انتقال کیا۔ مولانا عبدالحکیم کے اکثر حواشی کے رد آپ نے لکھے ہیں۔ اور چونکہ ملا عبدالرزاق اور مولانا عبدالحکیم کا زمانہ ایک ہی تھا اس لئے ممکن ہے لاہور۔ سیالکوٹ یا دہلی کسی مقام پر آپس میں ملاقاتیں بھی ہوئی ہوں اور وہ باتیں جو کاغذ پر تحریر ہوئی تھیں، زبانوں پر بھی آگئی ہوں۔

ملا عبدالرزاق کے بعد کشمیر میں ایک اور یگانہ روزگار عالم کا نام نظر آتا ہے جس نے ملا عبدالحکیم کے اکثر حواشی کا رد لکھا۔ اور ان کے خیالات کی تردید کی ہے۔

ملا ابوالحسن معروف بہ شاہم بابا تھا۔ ملا یوسف گنائی کاشمیری (وفات ۱۱۸۴ھ) کا قول ہے کہ جب ناظمان خطۂ کشمیر علماء کا مباحثہ کراتے تھے۔ تو آپ تفسیر بیضاوی اور حاشیہ عصام وغیرہ کی عبارتیں اس طرح بے تکلف اور بے تکان پڑھتے تھے جس طرح آج حافظ قرآن کو پڑھتے جاتے ہیں۔

## مولانا عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف

مولوی عبدالحکیم کی بیش تصانیف کا ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف علم نحو۔ علم کلام۔ علم منطق اور فلسفہ و الٰہیات میں ہیں۔ ان پر تبصرہ و تنقید کرنا اور اس قسم کے اہل علم کی مجلسوں کے بحث و مناظرہ پر رائے لکھنا تو بڑی قابلیت بڑے دماغ اور بہت بڑے منطقی و فلسفی کا کام ہے جو عربی کے ہر علم پر حاوی ہو لیکن یہ زمانہ تو اس قسم کی تاریکی کا ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے والے بھی شائد ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ مدرسہ نعمانیہ لاہور یا اسی قسم کی چند اور عربی درسگاہوں میں نظر آسکیں گے۔

ان حالات میں مولانا عبدالحکیم کی تصانیف کی تعداد بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن "سوانح ملک العلماء مولوی عبدالحکیم" کی خوش قسمتی سے مولانا مولوی محمود علی صاحب ایم۔ اے۔ ایم او ایل پروفیسر رندھیر کالج کپور تھلہ نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لیا۔ اور ان کی تین تصانیف پر جو علم نحو۔ علم منطق اور علم کلام کے متعلق ہیں ذرا تفصیل سے بحث کی۔

مولانا محمود علی۔ نے جس قابلیت سے مولانا عبدالحکیم کی ان تین کتابوں کے نفس مضمون۔ بحث مباحثہ اور طرز تحریر پر شبدیز قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور اُس زمانہ کے طرز تصنیف پر جس خوبی سے بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام کسی اور سے مشکل تھا۔ اور اگر آسان بھی ہوتا۔ تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ ان ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرتا منطق و نحو کی پیچیدگیوں اور اُلجھنوں میں مبتلا ہوتا۔ اور اپنے آرام کو حرام کرتا۔ یہ خونِ جگر تو وہی کھاتا ہے جس کو بزرگانِ سلف کا نامِ نیک قائم رکھنا منظور ہو۔ جو علمائے سلف کی منطقی و فلسفی بحثوں کے ٹکڑے بطور تبرک بانٹنا کارِ ثواب جانتا ہو۔ اور جسکو مولانا عبدالحکیم کے علوم حکمیہ و الہیات کا کچھ علم ہو۔

قبل اس کے کہ ہم مولوی محمود علی صاحب نے جو مولانا عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے درج کریں ایک نظم جو مولانا عبدالحکیم کے فضائل پر ہم کو موصول ہوئی ہے درج ذیل کرتے ہیں:-

## نظم در فضائل علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ مرحوم

جب میں نے پہلے پہل سنہ ۱۹۱۹ء میں علامہ سیالکوٹیؒ کے سوانحات عمری لکھنے کا ارادہ کیا تو سیالکوٹ۔ امرتسر۔ جہلم۔ لاہور اور ڈھاکہ کے خاص احباب سے جو علامہ مرحوم کے فضائل و حالات سے آگاہ تھے۔ اس کتاب کی تصنیف میں کچھ مدد طلب کی۔ اسی سلسلہ میں میرے دوست ملک محمد صاحب قادری۔ ٹھیکہ دار جہلم نے چند ابیات مولانا مرحوم کے متعلق ارسال کئے۔ جو ذیل میں شکریہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں:-

کلکِ من سر بہ خم شد از تسلیم
بہ ثنائے جنابِ عبد حکیم

شیخِ سنت امامِ فقہا بود
آن مفسر کلامِ ربِّ غفور

بر زبانش رموزِ قرآنی
در بیانش علوم یزدانی

در فروع و اصول گفت سخن
فقہ را از و چراغ شد روشن

چون قلم در بیان فلسفہ راند
منطقی را مجال نطق نہ ماند

پیروِ اجتہادِ نعمانی
ہم سبق با امامِ ربّانی

در اصول و فروع نکتہ شناس
منطق و فقہ را بلند اساس

در تصانیف برترش پایہ
ہمسرش کس نبود و ہمپایہ

ترجمانِ حقیقتِ قرآن
فخرِ احناف و مقتدائے زمان

گشت سالکوٹ جائے آرامش
در ہمہ ہند سکۂ نامش

صدرِ اسلامیان و شیخ الکل
رہنمائے طریقِ ختم رسل

شمعِ اسلام و افضل الفضلاء
فخرِ فقہاء و زینتِ علماء

فوق را ذوق یاد و قلب سلیم
کہ نوشد حیاتِ عبد حکیم

مرغِ طبعم پرید بہ اوجِ بلند
نظمِ موزون آورد بہ کمند

لیک قاصر بود ز وصفِ مولانا
معترف عجزِ خویش سرتاپا

اے فوق زین سخن زبان در بند
روحِ او را کن از دعا خورسند

---

لہ سیالکوٹ۔

# حاجی محمد سعید اور علامہ عبدالحکیم

تذکرہ اکابر اسلام میں لکھا ہے۔ حاجی محمد سعید ایک بڑے عالم فاضل اور قناعت پیشہ بزرگ تھے۔ اِن سے نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ جو شرافت و نجابت کے علاوہ علم میں بھی اُنکی برابری نہ کر سکتے تھے۔ اِن کے سامنے اپنی چالاکیوں اور زمانہ سازیوں سے بڑے بڑے مراتب پر پہنچ کر مالا مال ہو رہے تھے۔ مگر اُنھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ علامہ عبدالحکیم اور نواب سعد اللہ خاں وزیر کہ دونوں ہم مکتب اور علم و فضل میں یکساں درجہ رکھتے تھے۔ اور حاجی محمد سعید کے کمالات کے بھی معترف تھے[1]۔ شاہجہان کے حکم سے حاجی محمد سعید کے پاس آئے اور اصرار کیا کہ بادشاہ بُلاتا ہے۔ آپ ضرور تشریف لے چلیں۔ ایک اعلیٰ عُہدہ بھی آپکے سپُرد ہونیوالا ہے۔ مگر آپنے بادشاہ کے پاس جانے اور ملازمت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ علامہ عبدالحکیم مجبور ہو کر ناکام واپس چلے آئے ÷

# شیخ سعدی کی گلستان اور علامہ عبدالحکیم

کارنامہ[2] میں لکھا ہے۔ ایک دن نماز ظہر کے بعد مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی سر بزانو بیٹھے تھے کہ ایک شاگرد نے اس فکر و تردد کا سبب پُوچھا۔ کہا۔ شیخ سعدی کے اس فقرہ "از بستر نرمش بر خاکستر گرمش" کے جواب کا کوئی فقرہ سوچ رہا تھا۔ دماغ نے بہت چکر کھائے۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی ÷

---

[1] اور کیا عجب ہے۔ ان دونوں صاحبوں نے ہی بادشاہ کے پاس حاجی صاحب کا ذکر کیا ہو۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ حاجی صاحب سیالکوٹ میں تھے یا لاہور میں رہتے تھے ÷ [2] میرے والد صاحب قبلہ فرماتے ہیں ہمارے اُستاد مولوی الٰہی بخش مرحوم (آج سے قریباً پچاس سال پیشتر) ایک قلمی و غیر مطبوعہ کتاب کارنامہ جیب میں رکھا کرتے تھے۔ اُس کتاب میں نُدرت گلستان کے اِس اعتراف کا ذکر ہے جو سطور بالا میں درج کیا گیا ہے۔ ابوالفضل نے بھی شیخ سعدی کے اس فقرہ "اسبم بہ جو بود و نمد زین بگرد" پہ لکھا ہے میری ساری انشاپردازی ان چند الفاظ کا مقابلہ نہیں کر سکتی ÷

# تبصرہ

مولانا محمود علی نے علّامہ عبدالحکیم کی تین خاص تصانیف پر جو تبصرہ کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے اور درحقیقت یہی تبصرہ اس مختصر سی کتاب کی جان ہے:۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ (جنکو ممالک غیر کے علماء اپنی تصانیف میں "فاضل لاہوری" کے نام سے یاد کرتے ہیں) اُن ممتاز اور نامور علمائے اسلام میں سے ہیں جنکی تحریروں کو جوہر شناسانِ علم وفضل نے سر آنکھوں پر لیا۔ اور اعلیٰ ترین قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور جنکو نہ صرف فرداً فرداً اپنی علمی تشنگی کو بجھانے اور دماغ کو روحانی غذا دینے یعنی مطالعہ کا لطف اٹھانے کے لئے استعمال کیا بلکہ انکو دیگر رہروان بادیہ حکمت اور سالکانِ طریق فضیلت کیلئے مشعل راہ بنایا یعنی طالبانِ علم کے نصاب درس میں داخل کیا۔ اور نہ صرف ایک آدھ تصنیف کسی فن میں معتبر سمجھی گئی بلکہ مختلف فنون میں آپ کے تین کارنامے محققانہ معیار سے مستند ماننے گئے۔ اور مشتاقان علم کے لئے بیش بہا تحفہ قرار پائے۔

مولانا کس کس فن میں کمال کا رتبہ رکھتے ہیں۔ اور کہاں کہاں ان کے شبدیز قلم نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اسکا صحیح اندازہ مُلا میر زاہد^۵۷ یا اُن جیسے مولانا عبدالحکیم کے

۵۷۔ ملا میر زاہد فلسفہ والٰہیات کے نامور ترین علماء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اور ان کی تین تصنیفیں (میر زاہد رسالہ۔ میر زاہد مُلا جلال اور میر زاہد امور عامہ) درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ کسی کتاب میں تو دیکھا نہیں مگر اہل علم کی مجلسوں میں مسرت کے ساتھ یادِ رفتگاں کرتے ہوئے یہ ذکر ہُوا کیا ہے کہ جب مُلا میر زاہد ہرات سے ہندوستان میں آئے ہیں تو شاہجہان کے دربار میں ان کا مولانا عبدالحکیم سے مناظرہ قرار پایا۔ فریقین نے مختلف عالمانہ نکات میں ایکدوسرے کا امتحان لیا۔ اور اہل دربار میں علمی جواہر ریزوں سے اپنا جیب و دامن بھر لیا۔ آخر میں مولانا عبدالحکیم نے ایک ایسا سوال پیش کیا جس کو مُلا میر زاہد حل نہ کر سکے اور کامیابی کا فخر مولانا عبدالحکیم کو نصیب ہُوا۔ دربار میں فوقیت مولانا عبدالحکیم کو حاصل ہوئی۔ مگر اہل علم کا اپنا دربار الگ ہے۔ انمیں اس مباحثہ پر جو نکتہ چینی ہوئی تو فیصلہ یُوں کیا گیا کہ مولانا عبدالحکیم اپنی ذہانت وطباعی سے بحث کو قواعد لسانیہ کی طرف لے آئے کہ یہ رستہ انکا خوب دیکھا بھالا ہے (بقایا بر صفحہ ۵۸)

ہم پلہ حریف ہی کر سکتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بیشک تاریکی اور جہالت کی فضا میں آنکھ کھولی ہے اور علوم قدیمہ اسلامیہ کے متعلق جس کس مپرسی اور بے پروائی کا دَور دیکھا ہے۔ اس نامبارک عہد میں اگر کوئی شخص آپکی تصانیف کے بیشتر حصہ کو سمجھ سکے تو اپنے وقت کا فاضل متبحر کہلانیکا مستحق ہے۔ سمجھنے کے بعد صحت و سقم مضمون کی نسبت رائے قائم کرنا الگ رہا۔ اندریں حالات آپکی تصانیف کے متعلق جو کچھ لکھا جائیگا وہ سوانح عمری کے ایک باب کی خانہ پُری کرنے کی غرض سے ہوگا۔ ورنہ ایسا تبصرہ جسکو تنقید کہا جائے اور جسمیں تصنیف کی قدر و منزلت اور اس کے صحت و سقم کی تحقیق ہو۔ اپنی قابلیت سے بالاتر ہے۔

ان تصانیف کی نسبت کچھ لکھنے سے پہلے اُس زمانہ کے عام اور دلپسند طرز کی تصنیف کا ذکر کرنا ضرور ہے۔ اسلامیوں نے علم و فن کی جانب توجہ کی۔ اور تصنیف تالیف کا سلسلہ آغاز ہُوا۔ تو چونکہ تمام قوم کو جہالت کی تاریکی سے نکالنا اور ایسے مضامین کو لوگوں کے ذہن نشین کرنا مقصود تھا۔ جس سے اُس وقت تک ان کے کان آشنا نہ تھے۔ اسلئے ہر ایک مضمون کو نہایت سلیس۔ نہایت آسان اور نہایت مشرح طور پر بیان کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ ہمارے متقدمین علماء کی تصانیف قواعد لسانیہ میں مسائل مذہب میں اور علوم عقلیہ میں۔ غرض علم کے ہر شعبہ میں نہایت قریب الفہم نہایت مفصل اور نہایت صاف واقع ہوئی ہیں۔ وہ لوگ کسی فن کو بتامہ بیان کرنا چاہتے ہیں × × × × × × × × × × × × × × × یا علم کے کسی ایک یا چند مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ ہر حال میں ان کی تحریر پیچیدگی سے پاک اور اجمال و اختصار سے مبّرا ہوتی ہے۔ مگر اس طرح پر قوم میں علمی مذاق پیدا ہو گیا۔ اور تہذیب کی ترقی نے کئی طرح کی مصروفیتیں اور مختلف الاقسام مشاغل و افکار پیدا کر دیئے تو حسب قاعدہ طبیعتوں میں نفاست اور نزاکت پیدا ہوئی۔ اُدھر علم

(بقایا حاشیہ از صفحہ ۵۶) چنانچہ انہوں نے علم کُفر ف کا ایک ایسا سوال پیش کیا جو مُلا میر زاہد کو مستحضر نہ تھا۔ ورنہ اگر بحث علوم حکمیہ اور الہٰیات میں محدود رہتی تو میر زاہد کے آگے عبد الحکیم کی پیشرفت دشوار تھی۔ یہ فیصلہ صحیح ہو یا شاہی دربار کا غلغلہ تحسین۔ مدعا اس حکایت سے یہ ہے کہ مولانا عبد الحکیم کا پایہ جو زمانہ سلف کے علمائے کبار اور شاہان علم دوست کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکتا ہے اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ معمولی نوشت و خواند کے لوگ آپکی تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالیں اور کسی نتیجہ پر پہنچیں۔

کی چاشنی حاصل کرنے کے بغیر سوسائٹی میں اعزاز و افتخار پیدا کرنے کی کوئی صورت نہ رہی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ جہاں تک ہو سکے کم تر وقت میں علم کی بیشتر واقفیت حاصل ہو۔ اس کام کے لیے مختلف علوم کے چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف ہونے شروع ہوئے۔ جن میں سے کچھ تو اسی شکل کے ہیں جیسے ہمارے زمانے میں انگریزی کے اندر مینوئل کہلاتے ہیں۔ یعنی ہر علم کے چند نہایت ضروری اور موٹے موٹے مسئلے تحریر کر دیئے گئے جو تھوڑے وقت میں یاد ہو سکیں۔ اور علم کی ابتدائی واقفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوں۔ ایسے رسالجات مبتدیوں کے لئے بیشک کارآمد تھے اور تعلیم کی ابتدا انہی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی علم سے واقف ہونیکا دعوےٰ محض انہی رسالوں کو پڑھ لینے سے نہیں ہو سکتا۔ اور ضرورت باقی رہتی ہے کہ ان کے بعد مبسوط کتابیں مطالعہ میں آئیں جو وقت بہت لیتی ہیں۔ اس دقت کو رفع کرنے کیلئے قدرت نے ایسے افراد پیدا کیے جو مختصر نویسی میں نام بردار ہوئے۔ انہوں نے دریاؤں کو کوزوں میں بند کرنا شروع کیا۔ اور ہر فن کے اندر ایسی کتابیں مہیا کر دیں جو حجم میں موٹے رسالوں کے برابر تھیں۔ اور فن کے مضمون سے کوئی نکتہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں۔ مگر ایسے رسالوں میں اور ان کے بعد کی اکثر تصانیف میں ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ کثرت معلومات نے مصنفین کے دماغوں کو مرکز ثقل سے ایسا ہٹا دیا ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔ گرامر کی کتاب مگر اصطلاحوں کی تعریف کرتے ہیں یا قواعد کلیہ قائم کرتے ہیں، منطقی فلسفیانہ دلائل اور اعتراضات نظر آتے ہیں۔ تو انکو بھی اپنی اسی مختصر نویسی کے انداز میں درج کر جاتے ہیں۔ مذہبی مسائل اور ان کے تشریح و توضیح میں بکثرت سے فلسفیانہ اصطلاحیں اور اشارات درج کر دیتے ہیں۔ معقولات میں تعریف اور استدلال کے اثنا میں لفظوں کے ہیر پھیر اور طرز ادا کی درستی و نادرستی کا خیال آجاتا ہے تو گرامر اور فن بلاغت کے مسائل درج ہو جاتے ہیں۔ اور تحریر کو دشوار سے دشوار تر کر دیتے ہیں۔ غرض جس طرح فارسی اور اردو کی شاعری میں ہمارے ناظرین کو معلوم ہے کہ شعرائے متقدمین کی نسبت متاخرین نے پیچیدہ گوئی اور دشواری کو زیادہ کر دیا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح علمائے متقدمین و متاخرین کی طرز

تصنیف میں سلاست اور پیچیدگی ہمارے نقطۂ خیال سے آسانی و دشواری کا تفاوت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر اُس وقت ایک عرصہ کے علمی توغل اور کئی نسلوں کی روشن خیالی نے طبیعتوں کو ایسا ذکی اور ذہنوں کو ایسا تیز کر دیا تھا کہ معما اور چیستاں کو حل کرنے میں دشواری اور مجمل تحریر کے کو سمجھنے میں دِقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور ایک فن میں دوسرے فن کی آمیزش الجھانے کا ذریعہ اور ضیافت طبع کا سامان سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کے خلاف تمام کتاب میں ایک ہی مضمون پر بحث ہو تو طبیعت کے اکتانے کا سبب اور ملال کا باعث جانتے تھے۔ ایسی کتابیں ہر دلعزیز ہو گئیں۔ اور طالب علم ہر ایک فن کے ایسے ایسے رسالے جنکو اصطلاح میں متن کا نام دیا گیا ہے یاد کر لیتے تھے۔ پھر یا دیگر مشاغل میں مصروف ہو جاتے تھے یا تحصیل علم کا شوق رکھتے تھے تو کسی ایک یا چند فنون کے اندر مبسوط کتابوں کا مطالعہ جاری رکھ کر اپنے تئیں کمال کو پہنچاتے تھے۔

اب زمانے نے پھر پلٹا کھایا۔ اور اقبالمندی کے کمال نے بدن میں کاہلی اور دماغ میں کُندی پیدا کی تو مجمل رسالے دشوار نظر آنے لگے۔ اور مبسوط کتابوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ رہی۔ اس ضرورت نے ایسے لوگ پیدا کئے جو متنوں پر شرحیں چڑھائیں اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام کریں۔ مگر مختصر نویسی یا بالفاظ دیگر معما گوئی کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ اور کفایت شعاری کا سب سے زیادہ زور لفظوں پر خرچ کرنا کمال مانا جاتا تھا۔ اسلئے شارحین نے بھی جہانتک بن پڑا۔ کم سے کم لفظوں سے کام لیا۔ اور بعض شرحیں ایسی لکھی گئیں جن کے الفاظ کا شمار متن کے الفاظ سے بھی زیادہ نہ ہو۔[۵۷] کچھ عرصہ تک اِسی کو غنیمت سمجھا گیا۔ کہ متن کو ساتھ مِلا کر عبارت کم از کم دُگنی تو ہو گئی۔ مگر آخر تھیں شرحیں بھی متن کی ہم پلہ۔ طبیعتیں پھر گھبرائیں اور خیالات اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔

ہمارا یہ زمانہ ہوتا تو ایسے تمام متن اور شرحیں دریا برد کر دیجاتیں۔ اور سہل کتابوں کی تلاش ہوتی۔ کیونکہ ہم نے انگریزی علوم و فنون میں ہمیشہ سریع الفہم کتابیں داخل نصاب دیکھی ہیں۔ اور ہمارے علمار علوم اسلامیہ کے درس میں بھی ایسی ہی سہل متنوں کا اہتمام

۵۷۔ تفسیر جلالین کی نسبت مشہور ہے کہ اس کے اپنے الفاظ تعداد میں قرآن کریم کے الفاظ کے برابر ہیں

کرتے جاتے ہیں۔ مگر اُس وقت ایسا نہ ہوا۔ اور ایک خیال سے میں سمجھتا ہوں کہ بہتر ہوا۔
میں مختصر نویسی کا ایسا مدّاح نہیں ہوں مگر اکثر درسی کتابوں میں جو ایک فن کے اندر دیگر فنون کے تذکرے آجاتے ہیں اسکو فائدے سے خالی نہیں سمجھتا۔ انگریزی مدارس میں "آرٹس فیکلٹی" کے اندر متعدد علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اور جتنے سال تک تعلیم جاری رہتی ہے بار بار سب علموں میں امتحان لیا جاتا ہے کہ مضامین مستحضر رہیں۔ مگر یہ طریق کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اس میں مستحضر رہنا ایک طرف مضامین کو سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں ہوتی۔ اور اکثر الفاظ کو رٹ لینے سے کامیابی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اُس نصاب میں مختلف علوم کو ہمیشہ جاری رکھنے اور انکا استحضار لیتے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک علم کو پڑھتے ہوئے دیگر تمام مروّجہ علوم کے مسائل مستحضر ہوتے رہتے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ طالب علم مضمون کو سمجھکر آگے چل سکتا تھا۔ ورنہ محض عبارت کو برزبان کر لینے سے کام نہ چلتا تھا۔ غرض ہمارا طالب علم ایک سپاہی ہوتا تھا جو ہمیشہ جنگ کے لئے طیار اور جو بات پوچھی جائے اُسکا جواب دینے کیلئے مستعد ہے۔ مگر آج کا طالبعلم امتحان سے دوسرے دن کسی بات کے جواب دینے کا ذمہ دار نہیں۔ ہاں خاص فن میں کامل ہونے کا فائدہ ہمارے نصاب سے حاصل نہ ہوتا تھا۔ اور وہ فائدہ آجکل کی تعلیم سے بھی نہیں ہوتا۔ مطالعہ کرنیکے قابل ہوجانیکا فائدہ ہی اُس سے بھی مقصود تھا اور اس سے بھی۔ آگے ایک فنی ہونا طویل مطالعہ پر جب بھی منحصر تھا۔ اب بھی۔

بہر کیف شرح ملا کو مشکل سمجھکر چھوڑا نہیں گیا۔ اُنپر حواشی لکھے گئے۔ بعض وقت وہ بھی مجمل اور دشوار ہوئے تو حاشیہ پر حاشیہ چڑھا۔ اور جو مسئلہ متن میں سو پردوں کے اندر رکھا گیا تھا۔ اسپر سے کسی نے ایک کسی نے دو۔ اور کسی نے سب پردے اُٹھا دیئے مسئلہ کو صاف کیا۔ اس پر اعتراض وارد ہو تو اس کی تشریح کی اور جواب دیا۔ جواب پر اعتراض ہوا۔ یا اس سے کوئی نئی بحث پیدا ہوگئی تو اس کی تنقید ہونے لگی۔ پڑھنے والا بالکل ہی غبی ہو تو اور بات ہے ورنہ طالب علم کو ایک بات پر جبا یا جاتا ہے پھر اکھیڑا جاتا ہے کبھی ایک پہلو سمجھایا جاتا ہے کبھی دوسرا۔ اس کے دماغ کو دلائل کے پرکھنے کی۔ ان کے

ہر ایک نکتہ پر غائر نظر ڈالنے کی اور فیصلہ کرنے سے پہلے تمام اطراف و جوانب کو دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ وہ کتاب نہیں۔ جمناسٹک کا میدان معلوم ہوتا ہے۔ جہاں ڈرل ماسٹر لڑکوں کو کبھی بیٹھنے کا حکم دیتا ہے۔ کبھی بغل گننے کا۔ کبھی ہاتھ بلند کراتا ہے اور کبھی ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔ طرح طرح کی مشق سے ہر عضو کو کام کرتے اور مختلف حرکات سے اُن کے تئیں مضبوط بنانے کا اثر دکھاتا ہے۔ اُس تعلیم سے دماغی قوتوں سے یُونہی مشق کرائی جاتی تھی۔ ہمارے زمانے کی سہل گیر طبیعتیں اس طرز کو ناپسند کریں تو تعجب نہیں۔ افسوس ان بزرگواروں پر ہے جو اسی چمن کی گلچینی کر کے گلفروش کہلائے۔ اور اسی طرز تعلیم کی بدولت قوت فیصلہ سے بہرہ اندوز ہوئے اور پھر اپنے ہی بزرگوں کی محنت کو رائیگاں اور ان کی کوششوں کو بے سود مشہور کرنے میں سب سے سبقت کرنے اور نئی راہیں ڈھونڈنے لگے۔ وہ بزرگ انکی بات سُنتے تو یہی کہتے ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

اس کوشش اور کاوش میں بعض بزرگوں نے اپنا نصب العین اور زندگی کا مدعا ہی چمنستان علم کی نخل پیرائی اور مشکل کتابوں کی عقدہ کشائی کو قرار دیا۔ ان رہنمایانِ وادئ پُر خار میں میر سید شریف جرجانی۔ مولانا بحر العلوم عبد العلی لکھنوی۔ ہمارے مخدوم مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی۔ یا ہمارے قریب تر زمانے میں مولانا عبد الحلیم لکھنوی اور ان کے فرزند مولانا عبد الحی لکھنوی صفِ اول میں جگہ پانیکے مستحق ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت سینکڑوں قابل قدر بیش قیمت مگر مشکل تصانیف سے گرانبہا جواہر ریزے صاف و مجلا ہو کر ہم تک پہنچے۔ اور اسلامی لٹریچر کی نفیس سے نفیس نعمتیں اور باریک و لطیف بحثیں قیام و استحکام کا خلعت پہنکر اور سلاست و سہولت کے زیور سے آراستہ ہو کر نابینا کو بینا اور بے دست و پا کو کارفرما بنانے کا باعث ہوئیں۔ سمجھنے میں ہماری ہمت قصور کرے۔ اور ہماری نظر شپرہ چشمی دکھائے تو چشمۂ آفتاب راچہ گناہ۔

مولانا عبد الحکیم کی تمام تصانیف کا علم نہیں۔ جن کارناموں نے آپکو علمی دنیا سے روشناس کیا ہے اور جو تصانیف آپ کی طالبانِ علم کی رہنمائی میں استعمال ہوئی ہیں

انکا مدعا اپنی یادگار قائم کرنیکی خواہش، یا اپنے علم وفضل کو ظاہر کرنیکی آرزو کو برلانیکی بجائے بندگانِ سلف کے زرین کارناموں کو جلا دینا اور ان کے اسمائے گرامی کو حیات جاوید بخشنا ہے۔ یعنی علمی خدمت کے ساتھ ایثار اور عفریت جہالت کو زیر کرنے کیساتھ دیگر نبرد آزماؤں کی حمایت کو اپنا فرض قرار دیا ہے۔ اور وہ بھی ایسے ایسے موقع پر۔ جہاں کوشش پر کوشش ہوئی ہے مگر عقدہ کشائی نہیں ہوسکی۔ یعنی آپنے کسی متن کی شرح نہیں لکھی۔ کسی شرح کا حاشیہ نہیں لکھا بلکہ حاشیہ پر حاشیہ چڑھایا۔ اور ہمیشہ تخم زمین گیر کو گل وگلزار بنایا ہے۔ اور میں نے اس مضمون میں اپنے تمہیدی اظہار کو طول دیا ہے تو اسی غرض سے کہ اس کے بغیر ناظرین کو ایسی تصانیف کی ضرورت اور انکی قدر ومنزلت کی نسبت صحیح رائے قائم کرنے میں دشواری ہوتی۔

آنجناب کی ایک تصنیف فن نحو میں ہے۔ اسکا ماجرا یہ ہے کہ ابن حاجب نے شافیہ اور کافیہ نام کے دو رسالے صرف اور نحو میں لکھے۔ جنمیں ترتیب مضامین کے اسلوب کو بدلا جو پسند کیا گیا۔ اور مختصر نویسی کا وہ کمال دکھایا کہ تمام مسائل اور اصطلاحات فن کی تشریحیں، دو دو۔ تین تین لفظ کے جملوں میں ختم کیں۔ اور بہت چھوٹے حجم کی تحریروں میں تمام مہتم بالشان مسائل درج کر دیئے۔ ان دونوں رسالوں نے علمی دربار سے قبولیت کا خلعت پہنا۔ اور مختلف دیار وامصار پر تصرف کیا۔ ہر ایک رسالے کی اکثی کئی شرحیں لکھی گئیں۔ جن میں سے چند متن کے ساتھ قبولیت کی حصہ دار بنیں منجملہ ان کے کافیہ کی ایک شرح شاعری اور تصوف کے میدان میں شہسواری کرنیوالے مولانا عبد الرحمن جامی علیہ الرحمۃ کے قلم سے بھی نکلی۔ مگر کیسی شرح کہ متن کی طرح مختصر نویسی کا بہترین نمونہ اور مضمون کے لحاظ سے فن کی اعلیٰ ترین کتاب۔ قبولیت متن سے زیادہ اسپر حاشیہ ... نہ ہوئی اور مان لیا گیا کہ جس نے شرح جامی نہیں پڑھی اس نے نحو میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اختصار میں یہ کمال کہ ایک ایک لفظ کے اندر ایک نکات کا خزانہ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ شرح جامی کے اندر حرف حرف کے سایہ میں شیر سے ... اس گنج شایگان کو جو قدم قدم پر دفن کیا گیا ہے تفتیش وتلاش کرنے کی ضرورت خود مصنف ہی نے ... ہیں

محسوس ہونے لگی۔ اور مولانا جامی کے شاگرد ملا عبد الغفور نے اسپر حاشیہ لکھا جو طالبانِ علم کی بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ اور قریباً کتاب کے دو ثلث یعنی مبنیات میں اسماء الافعال کی بحث تک لکھا جا کر کسی وجہ سے بند ہو گیا۔ اول تو ملا عبد الغفور مولانا جامی کے شاگرد اور اسی طرزِ تحریر کے شیدا تھے اجمال کو پورے طور پر تفصیل نہ بنا سکے۔ دوسرے جو کچھ کیا وہ بھی نامکمل رہ گیا۔ اس نقصان کی تلافی مولانا عبد الحکیم کی قسمت میں تھی۔ آپ نے پہلے ملا عبد الغفور کی تحریر پر حاشیہ لکھا۔ پھر جسقدر کمی رہگئی تھی اسکی تکمیل کی۔ اور شرح جامی کا حاشیہ آخر تک پہنچایا۔ اس کوشش نے اپنی نوعیت کے بہترین متن اور اسکی بہترین شرح کو ایسا واضح کر دیا کہ اس مجموعے کے بعد عربی فن نحو کیلئے جسمیں اکثر زبانوں سے زیادہ پیچیدگی ہے کسی اور کتاب کی ضرورت نہ رہی

میں مولانا جامی کی اختصار پسندی و باریک بینی اور دونوں حاشیہ نگاروں کی متحدہ کوشش سے اس کے وضاحت پانے کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

۱۔ ذکر یہ تھا کہ کبھی جملہ اسمیہ کے مبتدا کو حذف کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس کی مثال میں ابن حاجب نے چاند دیکھنے والوں کا محاورہ پیش کیا۔ اور چاند دیکھنے والے کے لیے مستہل کا لفظ استعمال کیا۔ مولانا جامی نے مستہل کے معنے لکھے "چاند دیکھنے والا اور آواز بلند کرنیوالا" ایک لفظ اور دو دو معنے۔ مختصر نویسی کو دیکھتے ہوئے عجیب بات تھی۔ محشی کو اس اعتراض کا صاف کرنا ضرور تھا۔ ملا عبد الغفور نے لغت سے استدلال کیا۔ اور بتایا کہ مستہل جس مصدر سے نکلا ہے اُس کے معنے ہی دو ہیں۔ چاند دیکھنا اور آواز بلند کرنا۔ وہ اتنا کہکر خاموش ہو گئے۔ اور بات تب بھی رہگئی یعنی اعتراض یہ تھا کہ لفظ کے معنے چاہے کئی ہوں بولنے والا جب بولتا ہے تو ایک ہی معنے مراد لیا کرتا ہے۔ ماتن نے یہ لفظ استعمال کیا شارح کو بتانا چاہیئے کہ اس نے یہاں اس لفظ سے کونسا مطلب لیا ہے۔ اس غرض کیلئے شارح نے جو کچھ لکھا ہے غلط ہے ایک بار بولنے میں دو معنے مراد نہیں ہو سکتے۔ یہ کام مولانا عبد الحکیم کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا انہوں نے فرمایا کہ دو معنے لکھنے سے یہ مطلب نہیں کہ دونوں ہی مراد ہیں۔ بلکہ دکھانا یہ مقصود

کہ لفظ کے معنے دو ہیں۔ اور ماتن کے کلام میں دونوں میں سے ہر ایک مراد ہو سکتا ہے +

۴۔ اسم اشارہ کی بحث میں ابن حاجب نے لکھا ہے "کہا جاتا ہے ذا اشارہ قریب کیلئے ہے۔ ذٰلک بعید کیلئے۔ اور ذاک متوسط کیلئے۔" "کہا جاتا ہے" ایک زائد لفظ تھا۔ جو خاص اسی مسئلہ پر لکھا گیا۔ اسکی کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں کہ یہ لفظ بعینہ اسیطرح استعمال نہیں ہوتے بلکہ جو قریب کے لئے ہے بعید کیلئے۔ اور جو بعید کیلئے ہے قریب کیلئے۔ اور جو متوسط کیلئے ہے وہ دونوں کے لئے زبانِ عرب میں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس لئے ماتن کے معنوں کی تعیین کرنے کو فن کا کلیہ قاعدہ مقصود نہیں کیا۔ بلکہ "کہا جاتا ہے" کے لفظ سے اسکو تشکیک طور پر ذکر کر دیا ہے۔ ملا عبدالغفور فرماتے ہیں کہ کافیہ کے شارح رضی نے بھی یہی وجہ لکھی ہے مگر صحیح نہیں۔ کیونکہ فن بلاغت کے علماء لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ اپنے معنوں کے سوا دوسرے معنوں میں تاویل سے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی مثلاً قریب کا لفظ بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے تو ایسی صورت میں جبکہ شاعرانہ طور پر مبالغہ کیلئے اس کو بعید فرض کر لیا جاتا ہے۔ علمائے بلاغت کے اس بیان سے ثابت ہوا کہ معنوں کی تعیین فن کا کلیہ قاعدہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ذا اور ذلک قریب اور بعید معنوں کے لئے وضع نہیں کئے گئے۔ بعد میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ پس ابن حاجب نے "کہا جاتا ہے" کا لفظ اس لئے بولا ہو گا کہ یہ معنے استعمالی ہیں۔ یوں نہ کہتے عام طور پر یہ لکھ دیتے کہ ذا قریب کے لئے ہے تو سمجھا جاتا کہ لفظوں کی وضع بیان کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحکیم کو محشی کا یہ اعتراض غلط معلوم ہوا۔ وہ فرماتے ہیں کہ لفظوں کو وضع کرتے اور ان کے اندر معنی داخل کرتے کس نے دیکھا ہے۔ زبان میں لفظ جس معنے کیلئے کثرت سے استعمال ہوتا ہے سمجھا جاتا ہے کہ یہ اس معنے کیلئے وضع ہوا ہے۔ اور شارح اپنی توجیہ کو استعمال پر نہیں کثرت استعمال پر مبنی کرتے ہیں۔ یہ الفاظ جب کثرت سے ایک دوسرے کے معنوں میں استعمال ہوتے نظر آتے ہیں تو ان کے لئے خاص معنوں کی تعیین کلیہ قاعدہ کے طور پر نہیں ہو سکتی۔ اسلئے "کہا جاتا ہے" کہنے کی وجہ وہی صحیح ہوئی جو شارح نے لکھی ہے کہ

کسی کا خیال ہے۔ مصنف کا اپنا عقیدہ نہیں۔ اور فن بلاغت میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس رائے پر مبنی ہوگا کہ ان الفاظ کے معنے اپنے اپنے خاص ہیں۔

۳۔ فعل تعجب کی نسبت ابن حاجب لکھتے ہیں "فعل تعجب وہ ہے جو تعجب ظاہر کرنیکے لئے بنایا گیا ہو۔ اس کے دو صیغے ہیں ما افعلہ۔ اور افعل بہ"۔ مولانا جامی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں"۔ اور اس کے یعنی فعل تعجب کے یا اس چیز کے جو تعجب ظاہر کرنے کیلئے بنایا گیا ہو دو صیغے ہیں۔ ایک انمیں سے صیغہ فعل ہے جسمیں ما افعلہ کی سی شکل ہوئے"۔ یہی اس عبارت میں کافیہ کے الفاظ عربی خط میں اور مولانا جامی کے الفاظ فارسی خط میں لکھے ہیں۔ اس موقع پر ملا عبد الغفور کا حاشیہ ختم ہو چکا ہے۔ مولانا عبد الحکیم شرح جامی کی لفظ لفظ کی مصلحت بیان کرتے ہیں۔ "اسکے" ضمیر کا صیغہ ہے۔ مولانا جامی اس کے دو مرجع بیان کرتے ہیں۔ "فعل تعجب یا وہ جو تعجب ظاہر کرنے کیلئے بنایا گیا ہو"۔ مولانا عبد الحکیم لکھتے ہیں۔ "اس" کی ضمیر فعل تعجب کیطرف بھی عود کر سکتی ہے۔ کیونکہ احکام اسی کے بیان ہوتے ہیں اور فعل کی تعریف کی طرف بھی پھر سکتی ہے۔ کہ وہ قریب تر ہے اور اصطلاحی لفظ اور اس کے تعریفی الفاظ کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ شارح ضمیر کو پھیرنے کیلئے انمیں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اسلئے دونوں مرجع کہنے پڑے۔ "دو صیغے ہیں" کے بعد "انمیں سے ایک" کا لفظ اسلئے نہیں لکھا کہ یہ مبتدائے محذوف ہو۔ اور "ما افعلہ" اسکی خبر۔ کیونکہ "ما افعلہ" ترکیب میں بدل یا عطف بیان بھی ہو سکتا ہے۔ "انمیں سے ایک" کہنے سے مقصود صرف تثنیہ ماقبل کا مطلب بیان کرتا ہے۔ ابن حاجب کو دو صیغے ہیں لکھکر دونوں فعل لکھدینے چاہیئے تھے۔ مگر جو لکھا گیا ہے یعنی "ما افعلہ" صرف فعل نہیں پورا جملہ ہے۔ شارح کو کہنا پڑا کہ پورے جملے کا لانا ایک مجازی استعمال ہے ورنہ تعجب کا صیغہ محض فعل ہے۔ لیکن فعل بھی عام طور پر نہیں بلکہ وہ فعل جو "ما افعلہ" کی شکل میں لایا گیا ہو۔ شارح نے صرف فعل کا لفظ نہیں لکھا۔ صیغہ فعل کہا ہے۔ تا سمجھا جائے کہ صرف ما افعلہ ہی فعل تعجب نہیں بلکہ ہر ایک صیغہ جو اس وزن پر ہو۔ اس طرح پر

"انمیں سے ایک صیغہ فعل ہے جسمیں ما افعلہ کی سی شکل ہو۔" اس عبارت کا ایک ایک لفظ خاص مصلحت رکھتا ہے ٭

آنجناب کی دوسری تصنیف علم کلام میں ہے۔ امام نجم الدین نسفی کا ایک رسالہ عقائد اہلسنت میں تھا۔ جسکی علامہ تفتازانی نے شرح لکھی۔ رسالہ بالکل سادہ اور سلیس تھا۔ کیونکہ اسلامی اور بالخصوص اہلسنت کے عقائد میں کوئی پیچیدگی اور اشکال نہیں۔ مگر علامہ نے ہر ایک عقیدہ کا ثبوت پیش کرنیکا تہیہ کیا۔ جو عقائد دیگر مذاہب کے خلاف تھے انکی دلائل عقلیہ۔ اور جو فرقہ ہائے اسلامیہ کے خلاف تھے ان کے عقلی دلائل کے ساتھ نقلی ثبوت بھی پیش کیا۔ اور علم کلام کی چھوٹی سی کتاب بنا دی۔ جسمانیات سے بحث ہو تو تجربہ رہنمائی کر دیتا ہے اور بات کو طول نہیں ہوتا۔ عقیدہ روحانی قسم کی چیز ہے بالخصوص وجود باری۔ حشر و نشر اور ملائکہ وغیرہ اعتقاد۔ ایسی چیزوں کی متعلق آجکل تو لوگ مانتے ہیں کہ عقلی ثبوت مل ہی نہیں سکتا۔ نہ اسکی ضرورت ہے۔ مگر اُس زمانے میں ان مسائل کی عقلی بحث پر دفتر کے دفتر لکھے جاتے تھے۔ اور جو بات احساس سے بالاتر ہو اسمیں گفتگو کا دروازہ بند ہو ہی نہیں سکتا۔ ثبوت ثبوت کے اوپر اعتراض۔ اعتراض کا جواب اور جواب الجواب سلسلہ دُور تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ علامہ تو ہر ایک بات کو جلدی سے ختم کر دیتے ہیں مگر حاشیہ چڑہانے والوں نے معرکہ آرائی شروع کر دی اور طرح طرح کے فلسفہ اور الہیات کے مسائل معرض بحث میں آئے۔ منجملہ حاشیہ نگاروں کے ایک مولانا خیالی ہیں جو ہر بات کے اندر سے باریک نکات نکالنے میں کمال رکھتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں دو لفظی۔ اس کتاب کی فلسفہ تراشی اور مختصر نویسی نے عجیب پسندیدگی حاصل کی کہ نصاب میں داخل ہوئی۔ اور اسپر بھی کئی حاشیہ چڑھے۔ چنانچہ قُل احمد اور جُند وغیرہ وغیرہ کے علاوہ ہمارے مولانا عبدالحکیم نے بھی اسپر قلم اٹھایا۔ قبولیت کچھ کمال ذاتی پر منحصر ہے کچھ خداداد ہو۔ مولانا عبدالحکیم کا حاشیہ خیالی کا سبب سے بہتر نقل سمجھا گیا۔ اور درس میں شامل ہوا۔ کسی نے کہا ہے:۔

خیالاتِ خیالی بس بلند ست ۔ نہ در وے جائے قُلِ احمد نہ جُند ست

مگر عبد الحکیم از رائے عالی رہا کرد از خیالات خیالی

ایک اور بھی ڈھیلی ڈھالی بندش کا شعر کسی کا مشہور ہے :-

خیالات خیالی بس عظیم ست برائے حل او عبد الحکیم ست

میں اس ذکر سے اس اہتمام شان اور قدر و منزلت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو تعلیمی حلقوں میں ان دونوں عجیب تصنیفوں کو حاصل تھی۔ مگر زمانہ بدل گیا۔ اصول موضوعہ اور مسلمات عقلیہ کچھ سے کچھ ہو گئے تو جو دلائل حال کے مسلمات پر مبنی نہ ہوں اب ان کا کیا وزن؟ اسلئے میرے اپنے خیال میں اب وہ تارِ پود بھی بڑی حد تک بیکار ہو چکا ہے جو علامہ تفتازانی نے تیار کیا تھا۔ تو ان کے متعلق جرح و قدح اور اعتراض و جواب کی ضرورت کہاں۔ اگر میرا قول صحیح ہو تو آجکل کی نسل حاشیہ خیالی اور اس کے ضمیمہ جات کو تفنن طبع اور عقلی بحث میں روشن دماغوں کی بلند پروازیاں دیکھنے کیلئے مطالعہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ ورنہ مفید فن کلام کے متعلق معلومات میں اضافہ کرنے کی توقع ان تحریروں سے بہت کم ہے۔ البتہ علامہ تفتازانی کی کتاب یعنی شرح عقائد نسفی عقائد اہلسنت کی مکمل واقفیت حاصل کرنیکے لئے اب بھی مفید ہے۔ بالخصوص فرقہ ہائے اسلامیہ کے مختلف فیہ مسائل میں نقلی استدلال اور عقلی بحثیں اکثر نفیس اور دلچسپ واقع ہوئی ہیں۔

غرض جہانتک میں سمجھا ہوں۔ مولانا خیالی اور مولانا عبد الحکیم کی یہ کوششیں گذشتہ زمانہ کیلئے نہایت مفید۔ نہایت کار آمد اور نہایت برمحل تھیں۔ اور اپنے وقت میں بڑا کام کر چکی ہیں۔ مگر اب انکی میعاد ختم ہو گئی۔ اور سب نہیں تو ان کا بیشتر حصہ تقویم پارینہ کہلانے کا مستحق ہو گیا۔ یہاں ان بحثوں کے چند نمونے درج کرتا ہوں کہ آخر ہمارے بزرگوں کا تبرک ہے ناظرین کو اس سے شناسائی تو ہونی چاہیئے۔

۱۔ اس زمانے کے علمائے اسلام کا ایک سب سے بڑا اختلاف فلسفیانہ خیال والوں سے ہیولٰے و صورت اور اجزائے لایتجزے کا تھا۔ حکماء اجسام کو ہیولٰے و صورت سے مرکب ملنتے تھے۔ ان دونوں کو قدیم کہتے تھے۔ اور اسی بناپر افلاک اور ان کی حرکات کو قدیم جانتے تھے۔ اور کئی طرح کے ایسے خیالات قائم کرتے تھے جو عقائد اسلام کے خلاف تھے

ان تمام مباحث کو بیخ و بن سے برباد کرنے کیلئے علمائے اسلام نے ہیولیٰ و صورت کے وجود سے انکار کیا۔ اور اجسام کی ترکیب ایسے اجزاء سے تسلیم کی جو عقلاً اور وہماً اور فرضاً کسی طرح بھی تقسیم نہ ہو سکیں۔ عقلاً اور وہماً اور فرضاً کی قید علمائے کلام کی ایجاد تھی۔ اسکو چھوڑ کر یہ مسئلہ وہی ہے جو آجکل بھی مانا جاتا ہے۔ کہ اجسام چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہیں۔ غرض ایک زمانے میں یہ بحثیں بہت عروج پر تھیں۔ انکا پورا تماشا دیکھنا ہو تو کوئی شرح مواقف اور ادھر صدر شیرازی کی شرح ہدایت الحکمۃ دیکھے کہ ایک طرف جزء لایتجزیٰ کے اثبات پر۔ اور دوسری طرف اس کے تردید میں فلسفہ اور ریاضی کے کیسے کیسے زور خرچ ہوتے ہیں۔ شرح عقائد میں اس کا مختصر سا تذکرہ آیا ہے اور میانہ روی کے ساتھ دونوں طرف کے دلائل کو کمزور کہہ کر اور حکماء کا مذہب ماننے سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں انکو لکھ کر بات کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن ایک جگہ اجزاء کو مان کر یہ بحث کی ہے کہ جسم بننے کے لئے کم از کم کتنے اجزاء کا ہونا ضرور ہے۔ ایک یہ خیال لکھا ہے کہ دو جزؤں کے ملنے سے بھی جسم بن سکتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ کم از کم تین اجزا ہونی چاہئیں تا طول۔ عرض اور عمق تینوں ابعاد پائے جائیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کم از کم آٹھ اجزاء ہونی چاہئیں کہ طول۔ عرض اور عمق زاویہ قائمہ پر تقاطع کر سکیں۔ مولانا خیالی اور مولانا عبد الحکیم نے ان بحثوں کو خوب خوب رنگین کیا ہے۔ سب کے ذکر میں طول ہو گا۔ جسم بننے کی بحث میں مولانا خیالی تقاطع ابعاد کے لئے آٹھ اجزاء کی ضرورت پر اعتراض کرتے ہیں کہ تقاطع چار اجزاء کے ملنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کہ دو چیزیں پاس پاس رکھی جائیں۔ انمیں سے ایک کے پہلو میں تیسری رکھدو۔ اور تیسری کے اوپر چوتھی۔ ہمارے مولانا عبد الحکیم اس اعتراض کی تشریح کرتے ہیں۔ اور ایک غلطی مولانا خیالی سے بھی ہو گئی ہے اسکو ظاہر فرماتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ الف اور ب کو پاس رکھنے سے طول ہو گیا۔ ب کے پہلو میں ج رکھنے سے عرض ہو گیا۔ اور ب کے اوپر د رکھنے سے عمق ہو جائیگا۔ اور تینوں ابعاد نقطۂ ب پر ایکدوسرے سے ملیں گے اور زاویہ قائمہ بنائیں گے۔ یوں تو بے شک چار اجزاء کے ملنے سے ابعاد کا تقاطع ہو گیا۔ لیکن مولانا خیالی جو کہتے ہیں کہ د کے پہلو

میں تیسری اور اس پر چوتھی - یعنی الف ب میں سے ب کے پہلو میں ج اور ج کے اوپر د - اس صورت میں طول - عرض اور عمق تو پیدا ہو جائیگا مگر ان کا ایک نقطہ پر تقاطع نہ ہو سکے گا۔

۳- معتزلہ اور اہلسنت میں ایک اختلاف یہ ہے کہ معتزلہ انسانی افعال کو خود انسان کا مخلوق مانتے ہیں - اور اہلسنت کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال کو کسب کرتا ہے مگر پیدا انکو بھی خدا ہی کرتا ہے - علامہ تفتازانی اہلسنت کی ایک دلیل یہ لکھتے ہیں کہ اگر انسان اپنے افعال کا خالق ہو تو اسکو اپنے فعل کی تمام تفاصیل کا علم ہونا چاہیئے - کیونکہ جو چیز اپنی قدرت اور اختیار سے پیدا کیجائے وہ علم کے بغیر نہیں ہو سکتی - حالانکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کئی سکون ہوتے ہیں - کئی حرکتیں ہوتی ہیں - حرکت کبھی تیز ہوتی ہے کبھی آہستہ جس کا ہمیں شعور تک نہیں ہوتا - اس کے سوا جسم کے اندر عضلات اور اعصاب جو چلنے یا پکڑنے یا جھپٹا مارنے میں حرکات صادر کرتے ہیں وہ ہمارے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہوتی ہیں تو ہمکو انکا علم کہاں - اور علم نہیں تو ہم نے انہیں پیدا کیونکر کیا - مولانا خیالی اس موقع پر زیادہ بحث نہیں کرتے صرف دلیل کا تتمہ بیان کر دیتے ہیں کہ خالق ہونے کیلئے تو ایسے علم کی ضرورت ہے جو موجود نہیں مگر انسان کا کسب مانا جائے تو کسب کے واسطے اجمالی ارادہ اور علم کافی ہے جو موجود ہوتا ہی ہے - مثلاً ہم چلنے کا ارادہ کرتے ہیں علم ہوتا ہے کہ اب چلنے لگے ایک طرح کی حرکت شروع کر دیتے ہیں اس کے ضمن میں جو حرکات و سکنات اور عضلات و اعصاب کا فعل ضروری ہے وہ خدا کی طرف سے خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے - مولانا عبدالحکیم پہلے اس دلیل کو اپنے الفاظ میں واضح کرتے ہیں - پھر کسی کی طرف سے اعتراض کرتے ہیں کہ اول تو خلق اور کسب میں ایسا فرق ثابت کرنا دشوار ہے کہ ایک کیلئے علم کا ہونا ضروری ہو اور دوسرے کیلئے نہ ہو - اور اگر ایسا فرق مان بھی لیا جائے تو معتزلہ کہہ سکتے ہیں کہ تفاصیل کا علم ایسی مکمل تخلیق کیلئے ضرور ہے جیسی تخلیق خدا کرتا ہے - لیکن بندہ کی تخلیق جیسی ناقص اور ادھوری ہے ایسا ہی ناقص سا علم بھی اسکے لئے کافی ہے - اس اعتراض کا خود ہی جواب دیتے ہیں کہ تخلیق کے معنے کسی خاص چیز کو عدم سے وجود میں لانا ہے - اور کسب کے معنی ہیں

موجودہ چیز سے کام لینا۔ معدوم کو موجود اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ اسکی مقدار۔ اس کی شکل۔ اسکے شروط و لوازم سب کا علم ہو۔ مگر موجودہ چیز سے کام لینے میں ایسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ پس تخلیق ناقص ہو یا کامل جب اسے تخلیق مانا گیا تو اس کے لئے مفصل علم سے انکار نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اصطلاحی الفاظ کی تعریف میں بحث کو طول دینے سے اس زمانہ کے طلبائے مدارس آشنا نہیں ہیں۔ مثلاً وہ فن مکینکس میں حرکت کی تعریف ہمیشہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں دیکھتے ہیں کہ متحرک اُس جسم کو کہتے ہیں جو اپنی جگہ بدل رہا ہو۔ اس تعریف کے جامع مانع ہونے یا نہ ہونے کی بحث مکینکس میں کبھی نہ دیکھیں گے۔ ہاں میٹا فزکس یعنی علم مابعد الطبعیۃ میں اب بھی ایسی بحثیں ہوتی ہیں مگر ہمارے طلباء کا مطالعہ وہاں تک پہنچتا کم ہے۔ مثلاً حرکت ہی کے متعلق وہاں بحث ہوتی ہے کہ وہ صرف جگہ ہی کے بدلنے کا نام ہے یا حالت کے بدلنے کو بھی حرکت کہہ سکتے ہیں۔ کوئی اختلاف حالت کو بھی حرکت کا نام دیتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ حالت کا اختلاف ہوتا ہی اندرونی ذرات کی حرکت سے ہے۔ اسلئے اختلاف حالت میں بھی فی الحقیقت ذرات کے جگہ بدلنے ہی سے حرکت کا نام آسکتا ہے۔ ایسی یا اس سے ملتی جلتی بحثیں ہمارے علماء ہر اصطلاح کی تعریف میں کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر حرکت و سکون کا ذکر آگیا ہے تو علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ چیز ضرور کسی نہ کسی جگہ میں ہوگی پس اگر اس سے پہلے لمحہ میں بھی اسی جگہ تھی تو وہ ساکن ہے۔ اور اگر پہلے لمحہ میں اس جگہ کے اندر نہ تھی کسی اور جگہ میں تھی تو متحرک ہے۔ یہی مطلب ہوتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ دو لمحوں میں دو مکانوں کے اندر ہونے کو حرکت کہتے ہیں۔ اور دو لمحوں میں ایک مکان کے اندر ہونے کو سکون۔ اس پر ہمارے دونوں محشی بڑی بڑی بحثیں کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا خیالی ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ ایک چیز پہلے لمحہ میں ایک جگہ ہے۔ دوسرے لمحہ میں بھی وہیں ہے تیسرے لمحہ میں وہ دوسری جگہ چلی گئی ہے۔ تو دوسرے لمحہ میں اسکو متحرک سمجھو گے یا ساکن؟ مولانا عبدالحکیم اس اعتراض کی توضیح کرتے ہیں۔ پھر جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ چیز پہلے دو لمحوں میں ایک مکان کے اندر تھی۔ اس لئے اُن دونوں لمحوں میں اس پر سکون

کی تعریف صادق آتی ہے۔ لیکن دوسرے اور تیسرے لمحہ کو دیکھو تو ان دونوں میں اس نے مکان کو بدلا ہے۔ اسلئے اِن دونوں لمحوں میں حرکت کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس صورت میں دوسرا لمحہ اس پر ایسا گذرتا ہے جسمیں حرکت اور سکون دونوں کی تعریف صادق آتی ہے مگر بات یہ ہے کہ "دو لمحوں میں دو مکانوں کے اندر ہونے" کو حرکت کہنا علامہ تفتازانی کے اپنے الفاظ نہیں ہیں۔ کسی اَور کے الفاظ ہیں۔ اور ان الفاظ میں جو بے پروائی برتی گئی ہے اسکو دور کرنے کے لئے علامہ نے پہلے اپنے الفاظ میں تعریف کی۔ اور بعد میں کہدیا کہ اس کہنے والیکا بھی اصل مطلب یہی ہے۔ اور جو الفاظ علامہ نے استعمال کئے ہیں وہ صاف ہیں۔ ان کے رُو سے پہلے لمحہ کا خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس کے بعد دوسرے لمحہ میں جو حالت ہو اسکو حرکت یا سکون کہتے ہیں۔ پس جو چیز ایک لمحہ کے بعد دوسرے لمحہ میں اسی جگہ ہے وہ ساکن ہے۔ اور دوسرے کے بعد تیسرے لمحہ میں کہیں اَور جگہ چلی گئی ہے تو تیسرے لمحہ میں متحرک ہے۔ اس تعریف پر اعتراض وارد نہیں ہوتا ✦

آپ کی تیسری تصنیف منطق میں ہے۔ اسکا قصہ یوں ہے کہ رسالہ شمسیہ منطق کی چھوٹی سی کتاب ہے۔ اگرچہ مجمل مگر مسائل فن کیلئے کافی ووافی۔ اسپر علامہ قطب الدین شیرازی نے شرح لکھی۔ علامہ۔ علامہ ہونے کے علاوہ زبان عرب کے انشاپرداز بھی ہیں زبان شستہ۔ بیان سلیس۔ طرز ادا صاف سہل۔ ان کی یہ کتاب جو قطبی کے نام سے مشہور ہے اس فن کی درسی کتابوں میں بہترین تصانیف کہلانے کی مستحق ہے اور جو اختلاط مسائل فلسفہ اور دیگر فنون کا اس زمانے کی کتابوں میں عام ہے قطبی اکثر و بیشتر اس سے مبرا ہے۔ اسپر میر سید شریف کی توجہ مبذول ہوئی۔ انھوں نے حاشیہ لکھا خواجہ میر دشواریوں کی عقدہ کشائی میں مشاق ہیں۔ ان کا کلام بھی پیچیدگی سے پاک ہونا چاہیئے۔ اور ہے۔ لیکن معقولات کی بحث ایسی صاف۔ ہو ہی نہیں سکتی جیسی فن تاریخ یا دیگر علوم کی۔ یہاں تقریر کیسی ہی واضح ہو۔ ضرور کہیں نہ کہیں اشکال اور دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا عبدالحکیم کی طبیعت رسا ایسی دشواریوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ کہیں ملیں تو حل کریں۔ انھوں نے حاشیہ لکھا۔ جسمیں قطبی اور میر قطبی دونوں کے مقامات کو واضح کیا۔

منطق کی ایک مکمل کتاب کے سمجھنے میں جو دقتیں تھیں وہ سید شریف ورہنمائے مخدوم کی کوشش سے رفع ہوئیں۔ اور وہ باریک نکات۔ لطیف معلومات اور نفیس بحثیں اکثر اسی کتاب میں ہیں جنھوں نے مولانا عبدالحکیم کو قواعد لسانیہ کے ساتھ معقولات میں بھی مشہور عالم کیا۔ اور میرزاہد سے ٹکرایا۔ مولانا جہاں قطبی کی تحریر پر حاشیہ لکھتے ہیں وہاں قال اور جہاں میر کی تحریر پر لکھتے ہیں وہاں قولہ کے لفظ سے شروع کرتے ہیں۔ حاشیہ کے پہلے دو ثلث میں زیادہ تر میر کی اور ثلث آخر میں تشریح قطبی کی تشریح ہے۔ اب میں مضمون کتاب کے چند نمونے جو نسبتاً نہایت آسان اور سریع الفہم ہوں۔ درج کرتا ہوں:۔

۱۔ منطق میں کسی مدعا کو ثابت کرنے کیلئے دلیل مرتب کرنے کے قاعدے بنائے جاتے ہیں۔ یا کسی امر کو واضح کرنے کیلئے اسکی تعریف کرنے کے قوانین۔ جن الفاظ سے کسی امر کا تصور ذہن میں لایا جاتا ہے اسکو معرّف کہتے ہیں۔ علامہ شیرازی معرف کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ کسی چیز کا معرِف وہ ہے جس کے تصور کرنے سے ذہن میں لازمی طور پر اس چیز کا تصور آجائے۔ یا وہ چیز اور سب چیزوں سے ممتاز ہوجائے معرف سے چیز کا تصور مکمل طور پر پیدا ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ کسی نہ کسی طرح کا اجمالی تصور بھی کافی سمجھا جائے۔ میر سید شریف فرماتے ہیں کہ متاخرین اہل منطق کے نزدیک ضرورت ہے کہ معرف چیز کی حقیقت کو واضح کرے۔ یا اسکو تمام دیگر اشیاء سے ممتاز کردے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حقیقت کو واضح کرنا یا تمام دیگر اشیاء سے ممتاز کرنا معرف کیلئے ضرور نہیں ہے۔ اور جو الفاظ کسی چیز کو بعض دیگر اشیاء سے ممتاز کریں وہ بھی معرف کے تحت میں آسکتے ہیں۔ کیونکہ جسطرح کسی چیز کی حقیقت واضح کرنیکے لئے یا اسے تمام دیگر اشیاء سے ممتاز کرنے کیلئے معرف کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کسی چیز کو بعض دیگر اشیاء سے ممتاز کرنا بھی ایک کام ہے اور معرف کا محتاج ہے۔ پس اجمالی علم پیدا کرنے والے الفاظ کو بھی معرف کہنا چاہیئے۔ میر صاحب نے کہنے کے لائق بات فرما تو دی مگر اپنے استدلال کا بنیادی جملہ چھوڑ گئے۔ مطلب یہ تھا کہ حقیقت کو واضح کرنا یا تمام دیگر اشیاء

سے ممتاز کرنا بیشک ایک ضرورت ہے۔ جسکو پورا کرنے کے قاعدے مقرر ہیں۔ مگر دنیا میں بعض چیزوں کا محض اجمالی علم بھی ہوا کرتا ہے اور کبھی صرف اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے کہ چیز کو بعض اشیار گردوپیش سے ممتاز کر دیا جائے۔ اس ضرورت کو بر لانے کے بھی قاعدے مرتب ہونے چاہئیں۔ اور ایسے قواعد کا بتانا علم منطق کا فرض ہے۔ تو اجمالی علم کے قواعد بھی اسے سکھانے ہونگے۔ پس ایسے الفاظ جو کسی چیز کا اجمالی علم دیں معرف کے ضمن میں داخل سمجھکر ان کے قواعد پر بھی بحث ہونی چاہئے۔ ورنہ یہ فن نامکمل رہیگا۔ دلیل کا یہ حصہ مولانا عبد الحکیم نے پورا کیا اور بات صاف ہوئی ۔

۲۔ مدعا کو بیان کرنے یا دلائل کو ترتیب دینے میں جو جملے استعمال ہوتے ہیں انکو قضایا کہتے ہیں۔ منطق میں قضایا کی بڑی لمبی چوڑی بحث ہے۔ قضایا کی ابتدائی اور سب سے آسان تقسیم موجبہ اور سالبہ میں ہے۔ انکی تعریف مصنف شمسیہ نے یوں کی ہے کہ " اگر قضیہ میں یہ کہنا صحیح ہو کہ مسند الیہ مسند ہے تو وہ قضیہ موجبہ ہے۔ جیسے انسان ایک حیوان ہے۔ اور اگر یہ کہنا صحیح ہو کہ مسند الیہ مسند نہیں ہے تو وہ سالبہ ہے جیسے انسان پتھر نہیں ہے"۔ علامہ شیرازی کہتے ہیں کہ یہ تعریف قضایائے کاذبہ پر صادق نہیں آتی۔ مثلاً اگر کہا جائے۔ انسان پتھر ہے تو یہ ایسا جملہ ہے جسمیں مسند الیہ کو مسند کہنا صحیح نہیں۔ حالانکہ قضیہ موجبہ یہ بھی ہے۔ گو اس کے اندر کا دعوے غلط ہی ہو۔ اس اعتراض کے بعد وہ موجبہ اور سالبہ کی تعریف اپنے طور پر کرتے ہیں۔ مگر میر سید شریف فرماتے ہیں کہ صحیح ہونے سے واقعی صحیح ہونا مراد ہو تو بیشک شمسیہ کی تعریف غلط ہے لیکن اگر صحیح ہونے سے ایک عام مراد لی جائے کہ مسند الیہ کا مسند ہونا واقع میں صحیح ہو یا کہنے والے کے خیال میں تو پھر تعریف میں کوئی غلطی نہیں۔ جو شخص کہتا ہے کہ انسان پتھر ہے وہ اپنے خیال میں انسان کو پتھر ہی سمجھتا ہے۔ پس اس کے نزدیک صحیح ہے کہ مسند الیہ مسند ہے۔ مولانا عبد الحکیم کہتے ہیں کہ جو غلط جملے صحیح سمجھکر بولے جائیں ان کے لئے تو بیشک سید صاحب کا عذر معقول ہے۔ لیکن جب بولنے والا جان بوجھ کر جھوٹ بولے قضیہ اس وقت بھی موجبہ یا سالبہ ہوتا ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتے کہ واقع میں یا کہنے والے کے نزدیک

وہ اظہار صحیح ہے۔ ہاں صحت کی تعریف اور وسیع کرو کہ وہ اظہار واقع میں صحیح ہو یا کہنے والے کے نزدیک صحیح ہو۔ یا بظاہر صحیح اظہار کے طور پر ادا کیا گیا ہو۔ تو اس صورت میں بیشک سب قسم کے قضایا اس تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔ آگے علامہ تفتازانی کی رائے نقل کرتے ہیں اور اس پر بھی ایک اعتراض کر دیتے ہیں۔

۳۔ مصنف شمسیہ۔ قیاس یعنی دلیل کی تعریف میں لکھتا ہے کہ وہ ایک عبارت ہوتی ہے کئی جملوں سے مرکب اور ایسی کہ اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے تو ضرور ہی ایک اور جملہ کو جسے نتیجہ کہتے ہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ علامہ شیرازی فرماتے ہیں کہ "جملوں کا لفظ جمع کی شکل میں اسلئے لایا گیا ہے کہ دلیل کبھی دو جملوں سے مرکب ہوتی ہے جسکو قیاس بسیط کہتے ہیں۔ اور کبھی دو سے زیادہ جملے لانے پڑتے ہیں۔ اسے قیاس مرکب کہتے ہیں۔"
ان الفاظ پر سید صاحب کا حاشیہ ہی نہیں۔ مولانا عبدالحکیم علامہ تفتازانی کا قول نقل کرتے ہیں۔ کہ جہاں تک دیکھا گیا اور استقرار صحیح سے ثابت ہوا دلیل دو ہی جملوں سے مکمل ہو جاتی ہے۔ چھڑی بانس کی ہے اور بانس تیر سکتا ہے۔ بس دلیل اتنی ہی ہوتی ہے اور نتیجہ دیتی ہے کہ چھڑی تیر سکتی ہے۔ لیکن کبھی یہ دونوں جملے یا انمیں سے ایک خود کسی دلیل کا محتاج ہوتا ہے۔ اور کبھی انکی دلیلیں بھی کسی اور دلیل کی محتاج ہوتی ہیں اور ایسا سلسلہ کبھی لمبا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک مسلمات یا بدیہیات تک نہ پہنچ جائے ختم نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر تمام جملوں کو باہم ملا کر بیان کرنے سے خیال گزرتا ہے کہ دلیل کئی جملوں سے مرکب ہے۔ مگر حقیقت میں وہاں ایک دلیل ہوتی ہی نہیں۔ آگے پیچھے کئی دلیلیں ہوتی ہیں اور ہر ایک دلیل دو جملوں سے مرکب۔ پس قیاس مرکب کوئی چیز نہیں۔ قیاس بسیط ہی ہوتا ہے جسمیں دو سے زائد جملے ہو نہیں سکتے۔"

یہ مختصر تذکرہ ان زریں کارناموں کا ہے جو خطۂ پنجاب کو روشن کرنیوالے۔ اور شہر سیالکوٹ اور لاہور کو علمی دنیا میں ورد زبان بنانیوالے ہمارے مخدوم مولانا عبدالحکیم کے مبارک ہاتھوں اور ہمہ گیر قلم سے منصۂ ظہور پر آئے۔ زمانہ نے رفتار بدل لی۔ اسلامیوں سے علم و حکمت کا مذاق دور ہو گیا۔ بزرگوں کا نام اور انکا کام چند پرانی روحوں کے پاس

فرسودہ جسموں کے اندر دماغوں کے خلوت خانہ میں بند ہے یا کبھی کبھار زبان تک آ کر بیرونی دنیا کی سامعہ خراشی کر جاتا ہے۔ یہ روحیں سفر کر جائینگی۔ یہ جسم دفن ہو جائیں گے تو ان کا بھی خدا کے سوا کون ہے؟ وہ اپنے فضل سے آئندہ نسلوں کو بیدار کر دے اور ترکۂ اسلاف کی قدر شناسی کا میلان دیدے تو اور بات ہے ورنہ موجودہ حالت زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔

# مشاہیر سیالکوٹ

سیالکوٹ نہایت قدیم شہر ہے۔ اور ہندو عہد حکومت میں ہندو راجگان قدیم کی راجدھانی رہا ہے۔ دارالخلافہ ہونیکی وجہ سے یقیناً نامور ہندو اس سرزمین نے پیدا کئے ہونگے۔ کسی نے دولت و امارت میں شہرت حاصل کی ہوگی۔ کوئی علم سنسکرت کا کامل گذرا ہوگا۔ کسی نے سنسکرت و ہندی کے اشعار میں اپنے جوہر دکھائے ہونگے کوئی تیر و تلوار کا دھنی میدان جنگ میں اپنی نبرد آزمائی سے ارجن و بھیم کا نام زندہ کرتا ہوگا۔ موسیقی اور مصوری کے قدیم علوم ہند و تہذیب کا مایۂ ناز رہے ہیں۔ اس میدان میں بھی بڑے بڑے کامل الفن گذرے ہونگے۔ دان پن (خیرات) بھی ہندو قوم کی گھٹی میں داخل ہے۔ کئی سخی مرد پیدا ہوئے ہونگے۔ غرض جس شہر میں صدہا سال تک بادشاہ اور رعایا کا ایک مذہب رہا ہو۔ جس شہر نے صدیوں تک دارالحکومت ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہو۔ کچھ تعجب نہیں کہ گو شاہانہ سرپرستیوں کے طفیل بڑے بڑے کامل۔ عالم اور نامور لوگ وہاں پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن سیالکوٹ کی قدیم تاریخ چونکہ کہیں بھی نہیں ملتی۔ اسلئے ایسے یگانۂ روزگار لوگ جن کے واقعات زندگی موجودہ نسلوں کے لئے یقیناً رہبری کا کام دیتے۔ صفحۂ تاریخ سے بالکل ناپید ہیں۔ غرض ہندو عہد قدیم میں بھی اس خاک سے بڑے بڑے ودیا دان اٹھے ہیں۔ چنانچہ البیرونی جس نے محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کی ہے اپنی کتاب الہند میں جن شہروں کا ذکر کرتا ہے ان میں ایک سیالکوٹ بھی ہے۔ سیالکوٹ کو دیکھنے کی اسے بیحد تمنا تھی۔ لیکن وہ عدیم الفرصتی یا اور وجوہات سے سیالکوٹ تک نہ آسکا۔

ہندو عہد حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کا دور آتا ہے اور ۴۱۲ھ میں

سلطان محمود غزنوی پنجاب کو اپنی سلطنت کا ایک صوبہ قرار دیتا اور یہاں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھتا ہے۔ خاندان غزنوی سے لیکر خاندان لودھی اور بابر کے ابتدائی زمانہ تک سیالکوٹ کا ذکر تاریخ ہند کے اوراق میں کہیں کہیں نظر سے گذرتا ہے مگر اس زمانہ کے کسی مشہور آدمی کا نام تاریخ نہیں بتاتی۔ البتہ شیر شاہ سوری کے زمانہ سے بعض مشاہیر کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اور ان میں بھی صرف مسلمانوں کے نام ہمکو دکھائی دیتے ہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ ان تاریخوں، تذکروں اور مذہبی کتابوں کے لکھنے والے عام طور پر مسلمان تھے۔

شیعہ بادشاہان کشمیر کے زمانہ میں اکثر علمائے سنت ترک وطن کر کے پنجاب آئے ہیں اور ان میں سے اکثر نے سیالکوٹ کو اپنا وطن و مسکن قرار دیا ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں اکبر کی حکومت تھی۔ اسی وجہ سے مشاہیر سیالکوٹ میں چند ایک نام اہل خطۂ بزرگان دین کے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

بہر حال جسقدر مشاہیر کے نام سوری خاندان سے لیکر مغلیہ حکومت کے زوال و اختتام تک کے مل سکے ہیں مختصر سی کیفیت کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

**میاں وارث کاشمیری**۔ شیر شاہ سوری سے لیکر سکندر سوری کے زمانہ تک سیالکوٹ کے مالگذار اور تعلقدار رہے۔ اکبر کے ابتدائی عہد اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک یہ اعزاز برابر قائم رہا۔ مولوی کمال الدین کاشمیری استاد مولوی عبدالحکیم نے اسی میاں وارث کی مسجد میں امامت و درسگاہ شروع کی تھی۔

**حضرت شاہ حمزہ غوث** جنکا مزار پرانوار ناله ایک سے پار بابا کی بیر کے متصل ہے۔ عہد اکبری کے مشہور متوکل درویشوں میں سے تھے۔ اکبر نے سیالکوٹ آکر آپ سے ملاقات کی۔ اور خدا لم درگاہ کے لئے جاگیر مقرر کر دی۔ تاریخ وفات ؎

محمد غوث حمزہ قطب عالم — چو در وصل خدا گردید موصول
بتاریخ وصالش گفت قاصر — محمد متقی سلطان مقبول

جہاں آپکا روضہ ہے وہاں اب اتنی بڑی آبادی ہے کہ حمزہ غوث ہی کے نام سے ایک موضع آباد ہے

**بابا فتح اللہ حقانی رحمۃ اللہ علیہ** - حضرت بابا اسمٰعیل کاشمیری کے فرزند ارجمند تھے۔ جو صاحب ریاضت و کرامت تھے۔ اور جن کی بزرگی و عظمت اس سے ظاہر ہے کہ قدوۃ العرفا حضرت مخدوم محبوب العالم شیخ حمزہ صاحب کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ سے فیض حاصل کیا ہے۔ کشمیر میں چک بادشاہوں کا دور دورہ تھا جو مذہبا شیعہ تھے۔ ان کے بل بوتے پر شیعہ لوگ "اصحاب ثلاثہ" پر علانیہ تبرا کرتے تھے اور اہل سنت دم نہ مار سکتے تھے۔ بابا فتح اللہ بھی یہ حال دیکھتے تھے اور خاموش تھے۔ آپ نے اس خیال سے کہ اہل تشیع اصحاب ثلاثہ کو جو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کی بجائے میرے بیٹوں کے نام موسوم ہوں اپنے تینوں بیٹوں کے نام ابوبکر۔ عمر اور عثمان رکھ دیئے۔ جب تبرا کے علاوہ اہل سنت مسلمانوں پر جبر و ستم بھی ہونے لگا۔ اور ان کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ تو آپ معہ اہل و عیال کشمیر جیسے جنت نظیر وطن کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہکر سیالکوٹ چلے آئے۔ جب سیالکوٹ والوں کو آپ کے علم و تقوے کا حال معلوم ہوا تو تمام ارباب فضل و کمال ان کی طرف جھک پڑے۔ مولانا کمال اور مولانا جمال آپ کے داماد اور مرید و شاگرد تھے۔ تاریخ خواجہ اعظمی میں لکھا ہے کہ حضرت بابا فتح اللہ شاہ نے وفات بھی سیالکوٹ ہی میں پائی ہے۔

**بابا عمر حقانی کاشمیری** - شیخ العصر بابا فتح اللہ شاہ حقانی کے بیٹے تھے۔ آپ ہی کے پاس مشائخ کشمیر کی جماعت خواجہ اسحاق۔ بابا داؤد خاکی۔ شیخ یعقوب صرفی۔ ملا کمال وغیرہ ۲۸ علماؤ مشائخ اور رؤسائے کشمیر بانہال کے رستے سیالکوٹ آئے تھے۔ بابا عمر پر اکبر کی بیحد عنائتیں تھیں۔ آپ ہی کی وساطت سے علما و صلحائے کشمیر کی جماعت اکبر کے دربار میں پہنچی۔ اور اسی جماعت کی استدعا پر اکبر نے کشمیر کو خانہ جنگیوں سے نجات دلا کر ممالک محروسہ میں شامل کیا۔ تسخیر کشمیر ۹۹۴ھ / ۱۵۵۶ء کے بعد اکبر نے حضرت بابا عمر کو ۱۹۰۰ بیگھہ زمین[1] موضع رسول پور پرگنہ بنت حوالئے دہلی میں بطور جاگیر عنایت کی۔ دو موضع سیالکوٹ سے دیئے کہ سرکار پنجاب کے ماتحت تھا۔ اور چند قریہ خاندان بابا عمر کیلئے کشمیر میں وقف کئے۔ بابا عمر وفات کے بعد اپنے نامور باپ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

---

[1] روضۃ الابرار (فارسی) صفحہ ۵۱

**آخوند مولانا جمال**۔ علوم دینیہ میں ماہر کامل تھے۔ اصل وطن کشمیر تھا۔ ارادت معنویہ کے لیئے بابا فتح اللہ کاشمیری کے پاس سیالکوٹ آئے۔ مولانا کمال جو مولوی عبدالحکیم اور حضرت مجدد الف ثانی کے اوستاد تھے۔ آپکے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا جمال کے خوان علم سے صدہا لوگ سیر ہوئے۔ گوشت بہت کم کھاتے تھے۔ ہمیشہ بوریائے فرش پر سوتے رہے۔ حضرت بابا فتح اللہؒ نے اپنی ایک بیٹی کا آپ سے نکاح کر دیا تھا۔ آخر عمر میں آپ کشمیر واپس آ گئے۔ حضرت بابا نصیب اور شیخ اسمعیل چشتی اور دیگر اکابر و مشائخ وقت آپ کی بابرکت صحبتوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ قاضی ابوالقاسم عرف ملا جمالی جو کشمیر کی قضاء پر مامور تھے آپکے نامور فرزند تھے +

**آخوند ملا کمال**۔ مولانا جمال کے چھوٹے بھائی اور مولوی عبدالحکیم۔ حضرت مجدد الف ثانی۔ اور نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہان جیسے نامور شاگردوں کے اُستاد تھے شیخ کامل۔ حلّال دقائق۔ کشّاف حقائق۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ مجموعہ علم و عمل و زہد و تقوے تھے۔ مگر نسبت علمی بہت غالب تھی۔ سیالکوٹ اور لاہور میں مدت تک مسند تدریس و تلقین پر متمکن رہکر دور و نزدیک کے لوگوں کو علوم ظاہری و باطنی سے مستفیض کرتے رہے۔ اکبر اور جہانگیر کے دربار میں آپ کی بڑی وقعت تھی۔ سنہ ۱۰۱۷ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ آپ حضرت شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی وغیرہ مشائخ کشمیر کے ساتھ شیعہ بادشاہان کشمیر کے ظلم سے تنگ آکر پنجاب میں آئے تھے +

**مولانا محمد رضا**[1]۔ معروف بہ حکیم دانا۔ ابن مولانا کمال کاشمیری۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ برسوں تک سیالکوٹ میں علمی مشاغل کی رونق رکھی۔ جہانگیر نے آپ کی شہرت و قابلیت سُن کر آپ کو اپنی مجلس میں باریاب کیا۔ آخر عمر میں وطن کی محبت غالب آئی۔ اور سب کچھ ترک کر کے کشمیر چلے آئے۔ کشمیر میں جب اہل تسنن و تشیع کا

---

سلہ۔ روضۃ الابرار میں آپکا نام محمد صادق عرف حکیم دانا لکھا ہے یہ کتاب سنہ ۱۳۰۲ھ کی تصنیف ہے۔ اسرار الابرار میں جو بابا داؤد مشکواتی کی تصنیف ہے اور سنہ ۱۰۶۳ھ میں لکھی گئی ہے آپکا نام محمد رضا عرف حکیم دانا۔ اور مولانا کمال کا نام بو رضا محمد کمال درج ہے۔ کشمیر کی دیگر تاریخوں میں بھی محمد رضا نام ہی درج ہے۔ اور یہی صحیح ہے +

ایک زبردست مباحثہ و معارضہ جہانگیر کے عہد میں ہوا۔ تو اہل تسنن کی طرف سے
آپ ہی مناظر تھے یہاں تک کہ ملا حبیب اللہ شیعہ کو آپ نے ساکت کردیا۔ سری نگر
کے محلہ جمالٹہ میں رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا۔

**حاجی فتح محمدؒ**۔ سیالکوٹ کا محلہ حاجی پورہ انہی کے نام پر آباد ہے۔ یہ بزرگ
جہانگیر کے زمانہ میں وظیفہ خوار شاہی تھے۔ ہندو مسلمان بلا تمیز مذہب و ملت ان کی
سخاوت سے مستفیض ہوتے تھے۔ محلہ حاجی پورہ کی عالیشان مسجد انہی کی تعمیر کردہ
ہے۔ روضۃ الابرار[1] میں اخوند ملا نازک کاشمیری کے ذکر میں لکھا ہے کہ اخوند کو حاجی
فتح محمد سیالکوٹی کے مرید تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے آپ صاحب ارشاد بھی تھے۔
آپ کو روضۃ الابرار میں صاحب کمالات و کرامات لکھا ہے۔

**حاجی لال بیگ**۔ عہد جہانگیری کے وظیفہ خوار اور معافی دار تھے۔ دستر خوان
بہت وسیع تھا۔ موضع غازی پور جہاں آپکا مزار ہے آپ ہی کا آباد کردہ ہے جو
سیالکوٹ سے بجانب گوشہ شمال مشرق بفاصلہ ایک میل واقع ہے۔

**حاجی عبد الغنی**۔ بعض آپ کو حاجی عبد النبی بھی کہتے ہیں۔ جہانگیری عہد کے
پرہیزگار اور خدا پرست تھے۔ بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا سب غریبوں اور
مسکینوں کی تواضع میں صرف کردیتے تھے۔ مزار حضرت شاہ حمزہ غوث سے ذرا آگے
آپ کا مزار ہے۔

**حاجی مقصود**۔ یہ بزرگوار بھی شاہی وظیفہ خوار تھے۔ نہایت نیکوکار اور دین پرور
مزار آپکا غلہ (کنک) منڈی کے متصل واقع ہے۔ سنہ ۱۳۰۴ھ کے قریب مستری فضلدین
نے بہ لاگت کثیر آپ کا مزار مرمت کرادیا تھا۔

**شیخ رنگا ڈھیرہ**۔ سیالکوٹ کا ایک بہت بڑا امیر آدمی تھا۔ اس نے ایک عالیشان
باغ اور تالاب بنوایا۔ اور دونوں جگہ خوبصورت بارہ دریاں تعمیر کرائیں۔ ایک بارہ دری
تالاب کے وسط میں تھی وہاں موسم گرما میں بذریعہ کشتی سیر و آرام کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ

[1] ۔ روضۃ الابرار مصنفہ مولوی محمد الدین فوق مرحوم۔ مولوی فاضل۔ ایم او ایل لاہور مطبوعہ سنہ ۱۳۰۵ھ

باغ کی کل زمین پچیس گھماؤں تھی۔ اس باغ کا نام معہ اس کی عالیشان عمارتوں کے رنگ محل تھا۔ اسی رنگ محل کو اب رنگپورہ کہتے ہیں ÷

**شاہ سیدا۔** سیالکوٹ میں بزمانۂ جہانگیر بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ حضرت شاہ دولہ گجراتی جن کی عمر کا بہت بڑا حصہ سیالکوٹ میں گذرا ہے۔ انہی کے مرید تھے۔ مزار ان کا بازار کنک منڈی کے متصل واقع ہے ÷

**حضرت شاہ دولہ گجراتی۔** جہانگیر کے آخر عہد حکومت میں گھماں ڈوہرہ سیالکوٹ کے ہاں نوکر تھے۔ شاہ جہان کے زمانہ میں حضرت شاہ سیدا صاحب کی فیض صحبت سے پہلے ملازمت ترک کردی۔ پھر علائق دنیوی سے منہ موڑ لیا۔ سیالکوٹ کی نواح میں آپ نے بہت سے پل تعمیر کرائے ہیں۔ سیالکوٹ کی مشہور و معروف ایک ندی کا پل جو نہایت مضبوط اور چونہ گچ بنا ہوا ہے۔ آپ ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ مزار آپ کا گجرات میں مرجع خلائق ہے۔ روضۂ قیومیہ میں لکھا ہے صاحب جذبہ تھے۔ باطنی فیض آپ سے کسی کو نہیں پہنچ سکا۔ تذکرہ اکابر اسلام[ا] میں آپ کے متعلق لکھا ہے۔ بہت سے آدمی اس کے باورچی خانہ سے کھانا کھاتے تھے۔ اس نے بہت سے وحشی جانور اور چرند پرند جمع کر رکھے تھے۔ ہاتھی۔ شیر۔ اونٹ۔ بکری۔ بھیڑ وغیرہ۔ ان سب کو اس کے یہاں سے خوراک ملتی تھی ÷

**قاضی محمد عارف** جو مولانا غنی کاشمیری کا ہمعصر اور عہد شاہجہانی کے نامور شعرا میں تھا۔ تاریخوں میں سیالکوٹی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا جمال کے بیٹے قاضی ابوالقاسم کا فرزند تھا۔ ایک رباعی آپ کی یادگار ہے جو درج ذیل ہے:۔

خواہم کہ از ین نشیب و پستی برہم ۔۔۔ وز ننگ خودی و خود پرستی برہم
یک جرعہ ز جام نیستی نوش کنم ۔۔۔ از کشمکش خمار ہستی برہم

**ملا عیسیٰ۔** سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ زہد و تقوے

---

ا۔ ایک فارسی کتاب ہے جس میں علماء و مشائخ اسلام اور اساتذۂ اسلام کا ذکر ہے۔ مصنفہ منشی دیبی پرشاد مصنف و مورخ راجپوتانہ۔ مطبوعہ پیسہ اخبار ۱۹۰۷ء ÷

کے سرمایہ اور عالم ملکوتی کے سیّاح تھے۔ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں آکر کمالِ مکمل ہو گئے۔ علوم باطنی کے علاوہ علوم ظاہری میں بھی صاحب کمال تھے۔ کبھی سیالکوٹ میں رہتے کہ وہ ان کا وطن تھا۔ اور کبھی لاہور میں کہ وہاں ان کے پیر و مرشد حضرت میاں جی (حضرت میاں میر) رہتے تھے۔ دارا شکوہ لکھتا ہے ملا عیسیٰ کی میرے ساتھ خط و کتابت بھی رہی ہے۔ ان کو تمام چرند و پرند کا ذکر و شغل سنائی دیتا تھا۔ ملا عیسیٰ ایسے ہی اعلیٰ پایہ کے بزرگ تھے۔ جن کے ساتھ خط و کتابت کرنے کا ذکر شہزادہ دارا شکوہ نے خاص طور پر ایک قسم کے فخر کے ساتھ کیا ہے۔

**ملا محمد سیالکوٹیؒ**۔ حضرت میاں میرؒ کے مریدوں میں تھے۔ اور اپنے علم و فضل اور زہد و ورع کی وجہ سے حضرت کی نظروں میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔ سکینۃ الاولیاء میں شہزادہ دارا شکوہ لکھتے ہیں۔ سیالکوٹ ان کا وطن تھا۔ بیس سال تک خلوت و جلوت میں حضرت میاں میرؒ کے رفیق رہے۔ ملا محمد صاحب کے حوالہ سے سکینۃ الاولیاء میں ایک روایت بھی نقل ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ ملا محمد اور میاں تتھا لاہوری اور دو ایک اور آدمی حجرے کے باہر دیوار کے سایہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر اور سلوک و معرفت کی باتوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں بادل گھر آیا۔ سرد ہوا فراٹے بھرنے لگی اور مینہ برسنے لگا۔ جس سے اس دلجمعی میں تفرقہ سا آگیا۔ میاں تتھا نے جس پر یہانتک فضلِ الٰہی تھا کہ درخت تک بھی باوجود اس کے اُمّی محض ہونے کے اس سے ہمکلام ہوتے تھے۔ عرض کیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو مینہ اور ہوا ابھی دور ہو کر مطلع صاف ہو سکتا ہے۔ حضرت میاں میر صاحب کو میاں تتھا کے یہ جلالی کلمات ناگوار گذرے ناراض ہو کر فرمایا۔ او۔ تیلی کے بچے! اب تیری یہانتک نوبت پہنچ گئی کہ اپنی کرامتیں ظاہر کرتا اور خود فروشی کا متمنی ہے!۔ پھر بڑی نرمی اور مہربانی سے فرمایا۔ محمود کا فعل بھی محمود ہی ہوتا ہے۔ خبردار آئندہ اس قسم کے کلمات زبان سے نہ نکالنا اور کارخانۂ الٰہی میں دخل دینے کی جرأت نہ کرنا۔ شہزادہ نے سکینۃ الاولیاء ۱۰۵۲ھ میں لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ میاں محمد سیالکوٹی اب تک زندہ ہیں۔ میاں

محمد کا انتقال اسی سنہ کے بعد کسی سال میں ہوا ہے ؂

**اخون میر محسن سیالکوٹی** - روضۃ قیومیہ میں آپ کے متعلق چند الفاظ نظر سے گذرے ہیں۔ وہی لکھتا ہوں۔ "آپ حضرت قیوم ثانی رحمۃ (امام محمد معصوم ربانی خلف حضرت مجدد صاحب قیوم اوّل) کے معتبر خلفاء سے ہیں۔ صاحب استقامت و کرامت تھے۔ علماء و صلحاء میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ سلوک باطنی آپ نے انتہائی درجہ تک حاصل کر کے خلافت پائی۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے (روحانی و علمی) فائدہ اٹھایا۔ اور خلافت کا درجہ حاصل کیا۔ آپ طریقہ علیہ احمدیہ پر نہایت شدت سے پابند تھے ؂

**حافظ نور محمد سیالکوٹی** - آپ نے طویل عمر پائی ہے۔ درسی و رسمی علوم سے فارغ ہو کر سلوک و تصوف کی طرف خیال آیا۔ تو اپنے شہر کے نامور عالم و صوفی اخون میر محسن کے پاس پہنچے۔ وہاں دوا بھی تھی اور دعا بھی۔ یعنی علوم ظاہری و باطنی دونوں کا درس جاری تھا۔ حافظ صاحب اس مجلس سے کندن ہو کر نکلے۔ اور خلیفہ میر محسن کے مریدوں میں بھی داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اپنے مرشد کے پیر حضرت عروۃ الوثقیٰ قیوم ثانی کی خدمت میں سرہند میں پہنچے۔ وہاں نامی علماء و صلحاء جمع رہتے تھے۔ ان کی صحبتوں اور برکتوں اور حضرت قیوم ثانی کی توجہات سے ظاہری و باطنی علوم میں کمال فروغ حاصل کیا۔ پھر سنہ ۱۰۷۹ھ کے بعد بزمانہ عالمگیر جب حضرت حجۃ اللہ قیوم ثالث ہوئے تو ان کی خدمت میں بھی پہنچے۔ روضہ قیومیہ میں لکھا ہے کہ حافظ نور محمد صاحب حال و صاحب کرامات تھے۔ ان کے ارشادات و ہدایات نے بہت لوگوں کو انسان اور انسان سے مسلمان بنا دیا۔ حضرت قیوم ثالث کی وفات سنہ ۱۱۱۴ھ کے بعد آپ نے حضرت خواجہ محمد زبیر قیوم چہارم کی طرف رجوع کیا۔ اس وقت آپ بوجہ کبرسنی

۹۱ حضرت عروۃ الوثقیٰ امام معصوم قیوم ثانی فرزند سوم حضرت مجدد الف ثانی قیوم اول۔ ولادت حضرت قیوم ثانی ۱۰ شوال سنہ ۱۰۰۷ھ۔ وفات ۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۷۹ھ ؂

۹۲ حضرت حجۃ اللہ خواجہ محمد نقشبند ثانی قیوم ثالث۔ ولادت ۷ رمضان سنہ ۱۰۳۴ھ وفات ۲۹ محرم سنہ ۱۱۱۴ھ

۹۳ سلطان الاولیاء خواجہ محمد زبیر قیوم رابع۔ ولادت ۵ ذیقعدہ سنہ ۱۰۹۳ھ۔ وفات ۴ ذیقعدہ سنہ ۱۱۵۲ھ ؂

وضعف خود سفر کے ناقابل تھے۔ آپ نے اپنے چند مخلص و مرید آپ کی خدمت میں بھیجے۔ اور
ایک عرضداشت بھیجی کہ یہ بے پر و بال اس عالی خاندان کا تربیت یافتہ ہے۔ بہ سبب ضعف
باطنی حاضر خدمت نہیں ہو سکتا۔ دعا اور توجہ کیجیے کہ حق تعالیٰ اسے باطنی استقلال فرمائے
جب حضرت قیوم چہارم کا جواب آپ کو ملا۔ تو آپ نے شکر گذاری کے بعد اپنے یاروں سے فرمایا۔
حضرت نے اس کمزور بوڑھے کو از سر نو جوان کر دیا ہے۔ روضۂ قیومیہ میں لکھا ہے کہ آپ اپنے
زمانہ کے مشائخ عظام میں تھے۔ شیخ محمد سعید اور صوفی عبدالرحیم یہ دو نامور صوفی و عالم آپکے
پوتوں میں بہت مشہور گذرے ہیں۔ دونوں حضرت خواجہ محمد زبیر قیوم رابع کے مریدوں میں تھے
اور سرہند میں رہ کر ظاہری و باطنی علوم میں کامل ہوئے تھے +

**شیخ محمد سیالکوٹی**۔ حافظ نور محمد کے مریدوں میں تھے۔ جب حافظ صاحب حضرت
حجۃ اللہ قیوم ثالث کے مرید ہو گئے تو شیخ محمد بھی حضرت قیوم ثالث کے مریدوں میں داخل
ہو گئے۔ اور سلوک باطنی و علوم ظاہری میں کمال حاصل کرنے کی بدولت نہ صرف حضرت
حجۃ اللہ کے معتبر یاروں میں شمار ہونے لگے بلکہ آپ کو خلافت کا اعزاز بھی مل گیا۔

خلعت خلافت لیکر جب آپ سیالکوٹ واپس آئے تو آپ کی مجلس میں اہل طلب
وعلم اس کثرت سے آنے لگے۔ اور ارادتمندوں کی تعداد اس درجہ بڑھ گئی کہ آپ حافظ
صاحب سے منحرف ہو کر ان کو اپنا مدمقابل سمجھنے لگے۔ حافظ نور محمد بھی صاحب کمال تھے۔
صدہا لوگوں نے آپ سے باطنی فوائد حاصل کئے۔ بلکہ اکثروں کو خلافت بھی عطا کی۔ حافظ صاحب
کو آپ کی بعض باتیں ناگوار گذریں۔ اس زمانہ میں حضرت قیوم ثالث حج کو گئے ہوئے تھے۔
ان کی واپسی کی خبر سن کر شیخ محمد دکن جا کر ان سے ملے۔ اور اپنی اور حافظ صاحب کی بدمزگیوں
کا ذکر کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تک حافظ صاحب کو راضی نہ کرو گے تمہارا باطن صاف
نہ ہوگا۔ جب آپ واپس سیالکوٹ آئے تو آپ نے حافظ نور محمد صاحب سے معافی مانگی۔ مگر
حقیقی رنجش مرتے دم تک قائم رہی۔

شیخ محمد اپنے زمانہ کے نامور عالم و صوفی تھے۔ فقہ۔ حدیث۔ تصوف و سلوک سب
میں صاحب کمال تھے۔ عہد عالمگیری کے نامور علماء میں آپ کو شہرت خاص تھی +

**مولوی شیخ اصغر علی** ۔ حافظ نور محمد کے مرید تھے۔ انہی کے ایما سے حضرت خواجہ محمد زبیر کی خدمت میں بمقام سرہند حاضر ہوئے چونکہ مولوی صاحب۔ علم۔ حلم اور ورع و تقویٰ سے موصوف تھے۔ حضرت نے آپ پر بڑی نوازشیں فرمائیں۔ اور جب انمیں ظاہری و باطنی خوبیاں دیکھ لیں تو خلعت خلافت سے مشرف فرمایا۔ ان کے عہد کے ایک بزرگ خواجہ ابو الفیض کمال الدین محمد احسان مصنف روضۂ قیومیہ جنکا سلسلۂ نسب پانچ واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ تک پہنچتا ہے۔ مولوی صاحب کے متعلق یہ چشمدید واقعہ لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ سے ایسا فعل سرزد ہوا جو از روئے شرع مکروہ تھا۔ مولویصاحب اپنی اس حرکت سے بہت گھبرائے اور ایسے نادم ہوئے کہ کانپنے لگے۔ آخر اپنا چہرہ سیاہ کر کے شہر میں ڈھنڈورہ پٹوایا اور تائب ہوئے۔ حضرت خواجہ محمد زبیر نے مولویصاحب کے متعلق فرمایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص مُردہ کو زمین پر چلتے پھرتے دیکھنا چاہے وہ حضرت ابو بکر صدیق کو دیکھ لے۔ سو میرے یاروں میں مولوی اصغر علی موجودہ زمانہ میں زندہ مثال ہیں۔ مولوی صاحب ظاہری و باطنی علوم کے جیّد عالم تھے۔ کثیر التعداد لوگوں نے دونوں علوم میں آپ سے کثیر المنفعت فوائد حاصل کئے ہیں۔

صاحب روضۃ القیومیہ کی تحریر کے مطابق آپ محمد شاہ بادشاہ کے عہد (۱۱۶۱ھ) تک زندہ تھے +

**صوفی شیخ احمد کاتب** ۔ حضرت خواجہ محمد زبیر کے مریدان خاص میں تھے۔ سلوک باطنی حاصل کر کے خلافت حاصل کی۔ شریعت کے کاموں میں سختی سے پابند تھے۔ فن کتابت میں ماہر ہونے کی وجہ سے کاتب کے نام سے مشہور تھے۔ کثرت علم کے ساتھ حسن عمل بھی رکھتے تھے +

**صوفی محمد اعظم** ۔ حافظ نور محمد صاحب کے معتبر یاروں میں تھے۔ بلکہ ان سے خلافت بھی حاصل کی تھی۔ بعد میں حضرت خواجہ محمد زبیر کی خدمت میں بمقام سرہند حاضر ہو کر مورد عنایات رہے۔ آپ اپنے زمانہ کے نہایت نامور عالم تھے +

**مولوی عبد الکریم** ۔ آپ دو واسطہ سے مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی کے شاگرد ہیں۔ آپ

حضرت خواجہ محمد زبیر رح کے معاصر میں تھے۔ حضرت کی وفات (سنہ ۱۱۵۲ھ) کے بعد بھی آپ کی زندگی کا پتہ ملتا ہے۔ روضۂ قیومیہ کی تصنیف کا شروع سال سنہ ۱۱۵۰ھ کے قریب ہے۔ چند سال کے التوا کے بعد یہ کتاب سنہ ۱۱۵۴ھ میں پھر شروع ہوتی ہے۔ کتاب اسقدر ضخیم ہے کہ یقیناً اس کی ترتیب و تکمیل میں چند سال صرف ہوئے ہونگے۔ اور کتاب کے آخری صفحہ پر مولوی عبدالکریم کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب عہد محمد شاہی (سنہ ۱۱۶۱ھ) تک زندہ تھے ✤

**شیخ محمد صدیق** نام ایک بزرگ بھی حضرت خواجہ محمد زبیر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کا نام روضۂ قیومیہ میں حضرت خواجہ محمد زبیر کے مریدانِ خاص میں درج ہے ✤

**لالہ سیالکوٹی مل۔** عالمگیری یا محمد شاہی عہد میں اس نام کے ایک ہندو بزرگ سیالکوٹ میں گذرے ہیں۔ سنہ پیدائش و وفات کا کوئی حال معلوم نہیں ہے۔ ان کی ایک تصنیف انشائے سیالکوٹی زمانہ قدیم میں دوسرے نامور انشا پردازوں کی طرز تحریر کی لاجواب ٹکر تھی۔ ان کا نام بھی ان کے سیالکوٹی ہونے کی دلیل ہے ✤

**شیخ محمد مراد۔** راقم الحروف سنہ ۱۹۱۷ء میں ڈھاکہ (بنگال) میں تھا۔ جہاں مشرقی بنگال کے نامور علم دوست حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مشیر ٹیبی نواب صاحب ڈھاکہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب دیکھی۔ جس کے مصنف کا نام محمد مراد سیالکوٹی تھا۔ یہ کتاب عہد شاہجہانی یا عالمگیری کی تصنیف تھی۔ اسمیں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام رض کے لطائف کا ذکر تھا۔ علاوہ ازیں حضرت امام حسن رض اور امام حسین رض اور ازواج مطہرات کے باہمی مزاح کا بھی ذکر دیکھا گیا کتاب کے نفس مضمون۔ سنہ تالیف اور مصنف کے حالات کے لئے ڈھاکہ میں خط لکھا گیا۔ مگر کوئی اطمینان بخش جواب نہ مل سکا ✤

**مولوی میاں فضل سیالکوٹی۔** مولوی سید احمد صاحب[۱] بریلوی کے پنجابی خلفاء میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ سکھوں کے ساتھ سرحد میں جہاد میں بھی سید صاحب کے ساتھ

---

[۱] یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے نامی سیاح تھے۔ علاوہ اپنے ملک کے اکثر عرب عجم سب جگہ سے ہو آئے تھے۔ سنہ ۱۲۳۷ھ میں حج سے واپس آکر جب معلوم ہوا (باقی بر صفحہ آئندہ)

شامل رہے ہیں۔ یہ جہادِ سکھوں کے ساتھ ۱۲۴۱ھ سے ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ تک رہا ہے آپ نے ان مذہبی لڑائیوں میں بڑی شجاعت دکھائی ہے کشمیری الاصل تھے +

**شیخ محمد اخلاص خاں وامق**۔ وڈھیرہ قوم کے کھتری تھے۔ مولوی عبدالحکیم کے صاحبزادہ مولوی عبداللہ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ اور نام محمد اخلاص[۱] خاں رکھا گیا۔ یاوریٔ طالع نے رفتہ رفتہ اورنگ زیب کے دربار تک پہنچا دیا۔ اور اپنی قابلیت و علمیت کی وجہ سے سربلند ہو کر امیر الامراء کے مراتب و مناصب تک پہنچے۔ نظم و نثر میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ طرزِ جدید کی فارسی انشا پردازی میں ایسی مہارت تھی کہ عالمگیر نے بارہا احسنت و آفریں کے کلمات کہے۔ شعر و شاعری کا شغل گو عالم شباب تک ہی رہا۔ مگر علمی مشاغل مرتے دم تک نہ چھوٹے۔ ۱۱۴۳ھ میں (بعہد محمد شاہ بادشاہ) اپنے وطن سیالکوٹ میں وفات پائی۔ دو شعر تذکرہ صبح گلشن سے مل سکے ہیں۔ تبرک سمجھ کر درج کرتا ہوں ؎

ازتپش آسودن دل شاہدِ مرگِ دل ست — نبض از جنبش چو آساید رگ خواب فناست

محتسب مے کشی از دستِ تو مشکل شدہ است — شیشۂ مے بہ بغل آبلۂ دل شدہ است

**میر محمد علی رائج**۔ ساداتِ سیالکوٹ کے ایک نامور خاندان سے تھے۔ "سروِ آزاد" میں آپ کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی مرحوم نے چند سطور لکھی ہیں۔ انہی میں سے چند الفاظ یہاں لکھے جاتے ہیں :۔ آزاد مشرب خوش خلق اور خوش صحبت تھے۔ قلندرانہ طور پر رہتے تھے۔ بزمِ سخن ہمیشہ گرم رکھتے۔ اور لوگوں کو اپنے کلام سے مستفیض کیا کرتے ۱۱۰۰ھ میں بزمانہ عالمگیر طویل عمر پا کر مرحلۂ زندگانی کو طے کیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔ جب

(بقایا حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کہ سکھ مسلمانانِ پنجاب پر ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ اور ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں بھی رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ تو درویشانہ حالت چھوڑ کر سپاہیانہ لباس اختیار کر لیا۔ اور عمر کا باقی حصہ سکھوں کی استیصال ہی میں گذار دیا۔ اگر افغان اور سرحدی لوگ انکا پورا ساتھ دیتے تو پنجاب کا نقشہ بالکل بدل گیا ہوتا۔ ایک مرتبہ تو وہ پشاور پر بھی قابض ہو گئے تھے +

[۱] معلوم ہوتا ہے نام شیخ محمد یا محمد ہوگا۔ اخلاص خاں اس زمانہ کا ایک اعلیٰ سرکاری خطاب تھا۔ صاحب تذکرہ صبح گلشن نے غلطی سے اخلاص خاں کو اصل نام قرار دیا ہے +

میں جب ۱۳۴۷ھ میں سفر سندھ سے واپس ہوتا ہوا لاہور آیا۔ تو ایک عزیز جو میر رائج کا صحبت یافتہ تھا۔ میرے آنے کی خبر سنکر مجھ سے ملنے آیا۔ اور اسی نے مجھے میر رائج کے کچھ شعر سنائے۔ جن میں سے تین درج کیے جاتے ہیں ؎

روز وصل از بیم ہجران تو ام گریاں گذشت — آہ عید آمد پس از عمرے و در باراں گذشت

چہ ساں آں وقت میر جانانہ بر فتراک بستن — ز طفلی آں شکار افگن سپے واندکمر بستن

اگر با حق نیازی ہست حاجت نیست تکبیری — ستون بر سقفِ درویشان نمی بستند جا باشد

کتاب ہذا کی تصنیف کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ میر محمد علی صاحب دیوان بھی تھے۔ میں نے ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور) کی خدمت میں چٹھی لکھی۔ انہوں نے ۴۔ مارچ ۱۹۲۳ء کے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا کہ "میں نے محمد علی رائج کا دیوان فارسی میں بہت ضخیم دیکھا ہے۔ غالباً شاہجہان یا عالمگیر کے زمانہ میں تھے۔ ٹیک چند نے بہار عجم[1] میں ان کے اشعار کو جابجا محاورات فارسی کی سند میں لکھا ہے۔ ایک شعر ان کا مجھے بھی یاد ہے ؎

از جوانی ہم و قدر دیگر بہ پیری افتادہ ام — دوستاں رحمے کہ از بام بلند افتادہ ام"

اس خط کے بعد میں نے بہار عجم کو ٹٹولا۔ تو مندرجہ ذیل اشعار میر رائج کے وہاں نظر آئے

نازچوں بر زد ز روئے آتشین او نقاب — شرم خوباں را بہ برقع آب در غربال کرد

آب گیرد اشک از شرم کلامی کہ تراست — کہ یک آتش خوردہ از داغ غلامی کہ تراست

**شیخ رحمت اللہ** — اصل نام ہندوانی تھا۔ صاحب حشمت اور امیر کبیر تھے۔ دہلی میں اسلام قبول کیا۔ نام رحمت اللہ رکھا گیا۔ عالمگیر اس زمانہ میں بادشاہ تھا۔ جب اسے خبر ہوئی کہ ایک نامور اور امیر کبیر ہندو نے برضا و رغبت دین اسلام قبول کیا ہے تو منصب کے علاوہ جاگیر بھی عطا کی۔ سیالکوٹ سے بدرمعہ ہمراہیوں کے دہلی گئے تھے۔ وہاں سے رحمت اللہ اور جاگیر دار و منصب دار ہو کر واپس آ گئے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ خود کس قدر صاحب علم

---

[1] لغت کی لاجواب ضخیم کتاب ہے۔ ٹیک چند نے ۱۱۵۲ھ میں بعہد محمد شاہ بادشاہ لکھی تھی۔ اس وقت منشی ٹیک چند تخلص بہار کی عمر ۵۳ سال کی تھی۔ میر رائج کے اور شعر بھی بہار عجم میں تلاش سے مل سکتے ہیں۔

وفضل تھے۔ لیکن طالبانِ علم کی پرورش بہت کرتے تھے۔ ان کو خوراک۔ کپڑہ اور وظیفہ دیتے تھے۔ مسجد دو دروازہ جو شہر کے درمیان ہے انہی کی بنا کردہ ہے۔ وفات انکی فرخ سیر یا محمد شاہ غازی کے ابتدائی زمانہ میں ہوئی ہے +

**دلاور خاں نصرت** - اصل نام محمد نعیم تھا۔ ان کے باپ میر عبد العزیز شہزادہ دارا شکوہ کی سرکار میں نوکر تھے۔ دارا شکوہ کی برہمی وتباہی اور بالآخر اس کے قتل کے بعد محمد نعیم نے عالمگیر کا دامن پکڑا۔ بادشاہ نے قابل ولائق دیکھکر اعزاز بڑھایا۔ اور رفتہ رفتہ دو ہزاری منصب اور دلاور خاں خطاب سے سرافراز کیا۔ اسکے بیٹے کا نام میر محمد منعم تھا عنایت اللہ خاں کاشمیری کی لڑکی سے جب اس کی شادی تو باپ بیٹوں کے مراتب ومناصب میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ عنایت اللہ خاں اُمرائے عالمگیری میں درجہ اختصاص رکھتا تھا۔ میر منعم شاہ عالم اوّل کے عہد میں اپنے باپ کے خطاب "دلاور خاں" سے ممتاز ہوا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں جب نواب نظام الملک دکن کی صوبیداری پر مامور ہوئے تو دلاور خاں کو۔ کہ فن انشا پردازی وشاعری میں صاحب کمال تھا۔ اپنے ہمراہ دکن لیگئے اور ان کی بڑی عزت وتوقیر کی۔ جب نظام الملک کی جگہ امیر الامراء سید حسین علی خاں (برادر سید عبد اللہ خاں بادشاہ گر) صوبیدار دکن ہوئے تو انہوں نے دلاور خاں کو رائےچور کا جو آجکل سرکار نظام کا ایک ضلع ہے۔ فوجدار (کمانڈنگ افسر) بنا دیا۔ جب سادات بارھہ یعنی دونوں بادشاہ گر بھائیوں اور ان کے متعلقین کو بعہد محمد شاہ بادشاہ زوال آیا۔ اور نظام الملک آصف جاہ اوّل نے دکن میں دوبارہ اپنی صوبیداری مستحکم کرلی۔ تو دلاور خاں کو رائےچور سے حیدرآباد میں کہ دار الخلافہ تھا۔ بلالیا۔ اور اُس کے احترام وقربت میں نمایاں اضافہ کیا۔

۱۱۳۹ھ میں بعہد محمد شاہ بادشاہ غازی دلاور خاں نے انتقال کیا۔ اور وصیت کی کہ مجھے میرے مرشد شاہ ابراہیم کے پاؤں کی طرف دفن کیا جائے۔ مولانا آزاد بلگرامی "سروِ آزاد" میں لکھتے ہیں "شعر خوب میگوید۔ مضامین مرغوب مے بندد۔ و

ملہ حضرت شاہ ابراہیم کا مزار شاہ برہان الدین غریب کے روضہ واقعہ حیدرآباد کی دیوار کے قریب ہے +

دیوانش مرتب است"۔ لیکن یہ دیوان یقیناً گم یاب بلکہ نایاب ہے۔ چند شعر جو سروِ آزاد میں درج ہیں وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

بسکہ میدارد احیا در پردہ محبوب مرا | دیدۂ بیگانہ داند مہر مکتوب مرا
مژگاں ہم نہ آید دلدار بے نقاب است | کے خواب میتواں کرد در خانہ آفتاب است
بے ابروئے تو از نظرم دور مے رود | ایں تیر بے کماں چہ قدر دور مے رود
بمحفلے کہ بپائے در صد دو انجشند | چہ مے شود دل مارا اگر بما بخشند
نیست ممکن کہ بروئے تو دمے خواب مرا | مے زند دست بہ پہلو دل بیتاب مرا
چشم پوشیدہ تواں کرد سفر | چہ قدر راہِ فنا ہموار است
شیشۂ ساعت بود آئینۂ دنیا و دیں | گر یکے آباد گردد دیگرے ویراں شود
بر زمینے کہ او بہ ناز نشست | خاک بر سر گر آسماں نشود
بہ عقبٰے رسیدیم از ترک دنیا | نشد آنچہ از دست از پشتِ پا شد
روز بدیاری نمے آید ز یاراں دیدہ ام | سایہ ہم در زیر پا گم میشود وقتِ زوال

**مولانا جان محمد**۔ مولانا عبد الحکیم کے خاندان سے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی نے بارہ سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ تیمور شاہ کابلی نے بھی بڑی قدر کی۔ ان کے کچھ حالات مولوی عبد الحکیم کی اولاد و احفاد کے بیان میں لکھے جا چکے ہیں۔

**مولانا نادری**۔ نہایت عالم و قابل تھے۔ شاعری میں شہرت خاص تھی۔ صبح گلشن[1] میں آپ کے متعلق لکھا ہے۔ "نادری سیالکوٹی از نیکو فکران سیالکوٹ کہ مضاف صوبۂ لاہور ست۔ نکاتِ دقیقہ اش قابل خوض و غور"۔ آپ کی یادگار صرف ایک رباعی مل سکی ہے

من بودم و دوش یار سیمیں تن من | جمعے ز نشاط و عیش پیراہنِ من
ایشاں ہمہ صبحدم پراگندہ شدند | جز خونِ جگر کہ ماند بر دامنِ من

**مولانا حاجی**۔ وطن سیالکوٹ تھا۔ مگر علمی صحبتوں کی وجہ سے دہلی میں رہتے تھے۔

---

[1]۔ فارسی شعراء کا ایک تذکرہ جو نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کے فرزند نواب سید علی حسن خاں نے ۱۲۹۵ھ میں بزبان فارسی لکھا ہے۔

جامع فضائل ظاہری و باطنی تھے۔ محدث کامل اور فقیہہ متبحر تھے۔ میرزا مظہر جان جاناں دہلوی جن کا اصل نام شیخ شمس الدین العلوی ہے۔ فن حدیث میں آپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا مظہر جان جاناں[1] کو قوت کشفیہ اور اتباع سنت نبویہ اور علم و فضل میں شان عظیم حاصل تھی۔ اسی سے مولانا حاجی کی قابلیت کا اندازہ لگائیں۔

**مولوی عبداللہ۔** مولوی عبداللہ اپنے کمال علم و فضل اور اپنے درس فقہ و حدیث کی وجہ سے نمایاں خصوصیت رکھتے تھے۔ عہد عالمگیری کے نامور علماء میں تھے۔ اور عالمگیر کے دربار میں رسوخ خاص رکھتے تھے۔ مآثر الامراء[2] میں ان کے رسوخ و اقتدار کا ایک واقعہ درج ہے جسمیں لکھا ہے۔ ملا عبداللہ کی دربار عالمگیری میں بڑی رسائی تھی۔ کلانور (گورداسپور) کا ایک کھتری دیبی داس جو ملا کے ارشد تلامذہ سے تھا۔ اسی کی سفارش و وساطت سے عالمگیر تک پہنچا۔ عالمگیر نے اس کی لیاقت و قابلیت سے خوش ہو کر متاع خانہ کا منصب اور اخلاص کیش کا خطاب دیا۔ بعد میں آندور اور بیدر کی فوجداری (کمانڈنگ افسری) بھی عنایت کی۔ اور سال ۳۹ جلوس میں چہار صدی ۵۰ صد پنجاہ سوار کا جدید منصب عطا فرمایا[3]۔

تذکرہ اکابر اسلام میں مولانا عبداللہ کے متعلق لکھا ہے۔" اہل دولت سے کنارہ کش رہنے اور گوشہ نشینی میں باپ سے بڑھا ہوا تھا۔ عالمگیر ایک مرتبہ اجمیر میں تھا۔ اس نے خواجہ بختاور خاں کو مولانا عبداللہ کے پاس سیالکوٹ بھیجا۔ اور عہدہ صدارت تفویض کرنے کیلئے اجمیر بلوایا۔ مولانا نے کہا۔ خواجہ! میری عمر ساٹھ برس کی ہو گئی یہ وقت نوکری ترک کرنے کا ہے نہ کہ نوکری اختیار کرنے کا۔ چنانچہ خواجہ بختاور خاں ناکام واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے وہ عہدہ قلیچ خاں کو تفویض کر دیا۔ مولانا عبداللہ ۱۰۹۴ھ میں بعہد عالمگیر وفات پا گئے"۔

---

[1] بعمر نوسال ۱۱۹۴ھ ۱۰ محرم کو آپ ایک شقی القلب کے ہاتھوں بمقام دہلی شہید کئے گئے۔

[2] جلد اول صفحہ ۲۵۰ + [3] اخلاص کیش دیبی داس شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں پہلے مورد عتاب رہا۔ پھر بے قصور ثابت ہو کر دو ہزار پانصدی یک ہزار سوار کے منصب کو پہنچا۔ اور اخلاص خاں کا خطاب ملا۔

**شیخ ولی محمد ولی**۔ ان کے باپ شیخ منگلو نواب نجابت علی خاں والیٔ جھجر[1] کی پلٹن کے کرنیل تھے۔ یہ خود بھی نواب بہادر جنگ والیٔ بہادر گڑھ[2] کے رفیق و مصاحب رہے ہیں۔ تعلیم کی تکمیل اپنے وطن سیالکوٹ ہی میں کی۔ علاوہ دولت و تموّل کے دولتِ سخن سے بھی مالا مال تھے۔ شاہ نصیر دہلوی اور ذوق دہلوی کا زمانہ پایا ہے۔ شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ پیشتر ان کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ تذکرہ سخن شعرا میں مندرجہ ذیل دو اردو شعر آپ کی یادگار ہیں ؎

عالم خانہ بدوشی میں کہاں گھر اپنا | کیونکہ بتلاؤں نشاں تمکو ستمگر اپنا
جب آفتاب رخ کے مقابل نہ ہو سکا | رتبہ تھا کیا قمر کا۔ کہ کرتا وہ ہمسری

**شاہ خوشی قاضی سیالکوٹ** راقم الحروف نے سیاحت کشمیر (۱۹۲۴ء) کے ایام میں ایک کتاب منظوم گلدستۂ سخن[3] کے نام سے دیکھی۔ جس کے مصنف جوت پرکاش شوقی ایک ہندو بزرگ تھے اور عہد عالمگیری میں کشمیر اور لاہور کی نظامتوں میں اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک منظوم خط شاہ خوشی کے نام لکھا ہے جو اس زمانہ میں سیالکوٹ کے قاضی تھے۔ اور عالمگیر کے دربار میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ چند اشعار ذیل میں درج ہیں:۔

سحرگاہ نویدے رسیدم بگوش | کہ شخصے است از دوستانِ خوشی
عجب عندلیب است نادر بیاں | کہ مے آید از بوستانِ خوشی
چو رہ یافت در خلوتِ خاص گفت | کہ مے آیم از آستانِ خوشی
دعائے رسانید با تہنیت | بصد آب و تاب از بیانِ خوشی
بیاں کرد آنکہ کمالاتِ خویش | کہ بالیست از کاروانِ خوشی
متاع گرانمایہ بیروں کشید | زکانِ خوشی بل دکانِ خوشی
خداوند را بسکہ محظوظ ساخت | بغرس نو و ترجمانِ خوشی
جوابے بصد مہربانی شنید | رواں شد بسوئے جہانِ خوشی
بہنگام رخصت چنیں گفتمش | کہ ہر گہ رسی در مکانِ خوشی
سلامے ازیں بندہ خواہی رساند | بخلوتگہ رخ ادمانِ خوشی

[1] و [2]۔ جھجر و بہادر گڈھ کی دونوں ریاستیں بوجہ فسادات غدر ۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گئیں۔ بہادر گڈھ اب ایک معمولی قصبہ ہے۔ اور جھجر دہلی کی ایک تحصیل ہے۔ [3]۔ اس کتاب میں ۱۱۱۸ھ تک کے بعض واقعات و حالات منظوم ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے چند سال بعد کی تصنیف ہے۔

# مختصر تاریخ سیالکوٹ

## سیالکوٹ کی تواریخیں

سیالکوٹ کی دو تواریخیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں - ایک بندوبست کی تاریخ ہے - اور ایک کا نام " وقائع زمستان حصار " یا تاریخ سیالکوٹ ہے -

تاریخ بندوبست سیالکوٹ بہت بڑے حجم کی کتاب ہے - اسمیں تاریخی حالات بہت کم ہیں - قوموں، اور گوتوں اور ذیلداریوں اور نمبرداریوں اور گاؤں کی ذات وار تقسیموں اور قوموں کے رسم و رواج کے حالات اسمیں زیادہ درج ہیں -

" وقائع زمستان حصار " کا نام تو تاریخ سیالکوٹ ہے - لیکن درحقیقت اس کے بعض واقعات افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے - مصنف نے تحقیق و تفتیش اور افسانہ نویسی کو تاریخی واقعات سے تطبیق کرنے میں زیادہ محنت سے کام نہیں لیا -

سیالکوٹ کا ڈسٹرکٹ گزیٹیر بھی قابل دید ہوگا - لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہو سکا -

سیالکوٹ اتنا قدیم شہر ہے - اور اس کا تعلق ملک کے پالیٹکس سے اس قدر رہا ہے کہ تاریخ فرشتہ - تاریخہائے کشمیر - سیر المتاخرین - تاریخ ہائے پنجاب اور بعض اور تاریخوں میں کہیں کہیں اسکا ذکر آجاتا ہے -

میں نے کوشش کی ہے کہ متذکرہ صدر تاریخوں سے سیالکوٹ کے متعلق جسقدر معلومات مجھے حاصل ہوں - وہ میں مختصر طور پر اس ضمیمہ میں درج کردوں -

## سیالکوٹ کی وجہ تسمیہ

قریباً پانچہزار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گذرا - راجہ شل نے جو نکل اور سہدیو کا ماموں اور پانڈو کا رشتہ دار تھا - اسکو آباد کیا - اس زمانہ میں سیالکوٹ کا نام شاکل تھا - چنانچہ مہابھارت کے کرن

میں راجہ شل کی نگری" شاکل" کا اس طرح ذکر ہے۔ کہ یہ نگری اپگا ندی کے کنارہ پر مدر دیس میں واقع ہے۔ مدر دیس اس زمانہ میں پنجاب کا نام تھا۔ اور سیالکوٹ کی مشہور ندی ایک اس زمانہ میں اپگا ندی کہلاتی تھی۔

سیالکوٹ کی وجہ تسمیہ میں ایک اور بیان بھی نظر سے گذرا ہے۔ جس کو زیادہ تر قرین قیاس بتایا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ راجہ بکرماجیت کے زمانہ میں جسکو ایک ہزار نوسو اسی سال گذر چکے ہیں۔ راجہ شالباہن نے یہاں ایک قلعہ بنوایا۔ قلعہ کو پنجابی زبان میں کوٹ کہتے ہیں۔ اس لئے قلعہ کا نام شالکوٹ۔ اور بعد میں سیالکوٹ مشہور ہو گیا اور اسی نام سے شہر کی شہرت بھی ہو گئی۔ راجہ شالباہن کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو تارک الدنیا اور فقیر ہو کر شہزادہ پورن سے پورن بھگت کہلایا۔ جس کے کئی قصے پنجابی زبان میں تصنیف ہو گئے ہیں۔ اور جس کے گیت پنجاب میں ہر جگہ گائے جاتے ہیں دوسرا رسالو[1] جس کے متبنیٰ راجہ کرم کی اولاد ملک مانجھ نواح لاہور میں عرصہ دراز تک برسر اقتدار رہی۔

## خاندان غزنوی و غوری کا تعلق سیالکوٹ سے

راجہ شالباہن کے زمانہ سنہ ۱ بکرماجیتی سے لیکر جو سال ہجری سے قریباً ۶۳۹ سال پیشتر شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۴۲۰ھ یا ۱۰۲۹ سال کے طویل زمانہ تک سیالکوٹ کے حالات پر بالکل تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں سیالکوٹ کی سرزمین نے کیا کیا انقلاب دیکھے ہونگے۔ اور اس سرزمین نے کس کس دل و دماغ کے انسان پیدا کئے ہونگے۔ لاہور کے برہمن راجگان جے پال و آنند پال وغیرہ کی حکومت تمام پنجاب پر تھی۔ اور گو سیالکوٹ میں ایک الگ راجدھانی تھی لیکن وہ راجہ پنجاب کے راجہ کے ماتحت ہی سمجھا جاتا تھا۔

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ یہی راجہ رسالو راجہ نل کا داماد تھا۔ جو اس زمانہ میں ٹیکسلا متصل سرائے کالا ضلع راولپنڈی کا راجہ تھا۔ اسی مقام (ٹیکسلا) پر انگریزوں نے سنہ ۱۹۱۲ء سے کھدائی کا کام کئی میلوں میں شروع کر رکھا ہے۔ بہت سے بت۔ مورتیاں۔ سکے اور برتن اس زمانہ کے کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۰۱۲ھ میں یعنی راجہ شالباہن کے زمانہ سے ایک ہزار اکیاون سال کے بعد محمود غزنوی پنجاب میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں بھی سیالکوٹ کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ تمام پنجاب مع سیالکوٹ غزنوی حکومت کے ماتحت تھا۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ محمود نے سیالکوٹ کی حکومت راجۂ قدیم کے نام پر ہی رہنے دی تھی۔ البتہ اس کی نگہداشت اور اس کی نقل و حرکت کا خیال رکھنے کیلئے دس غزنوی سپاہی قلعہ میں متعین رہتے تھے۔

تاریخ فرشتہ میں شہاب الدین غوری کے حالات میں لکھا ہوا ہے۔ جب سنہ ۵۸۰ھ میں شہاب الدین غوری دوسری مرتبہ لاہور آیا۔ تو خسرو شاہ غزنوی وہاں کا حاکم تھا۔ شہاب الدین نے لاہور کو غارت و تاراج کرنے کے بعد سیالکوٹ کا رخ کیا۔ وہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اور حسین خرقیل کو قلعہ دار اور سیالکوٹ کا حاکم مقرر کیا۔

جب شہاب الدین واپس چلا گیا تو خسرو ملک جو جان چھپائے پھرتا تھا سیالکوٹ کے پہاڑوں[۱] سے باہر نکلا۔ اور گکھڑوں اور دوسرے اہل ملک کی مدد سے قلعہ سیالکوٹ پر حملہ آور ہوا۔ اور محاصرہ کرکے حسین خرقیل کو بہت تنگ کرنے لگا۔ شہاب الدین کو خبر ہوئی۔ وہ سنہ ۵۸۲ھ میں لشکر جرار لے کر پھر سیالکوٹ آیا اور خسرو اور اس کے بیٹے ملک شاہ اور اس کے دیگر اہل خاندان کو باندھ کر غزنی بھجوا دیا۔ جہاں سب موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

پنجاب میں غزنوی خاندان کی حکومت قریبًا پونے دو سو سال تک رہی ہے اور غزنوی حکومت کے بعد پنجاب پر خاندان غلاماں۔ بلبن اور خلجی کا عہد بھی قریبًا اسی قدر عرصہ تک رہا ہے۔ مگر جو واقعہ خسرو اور شہاب الدین غوری[۲] کا بیان کیا گیا ہے

[۱] جموں کے پہاڑوں کا سلسلہ زمانہ قدیم میں کوہستان سیالکوٹ ہی کہلاتا تھا۔ اس زمانہ میں جموں کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک معمولی جگہ شمار ہوتا تھا۔ [۲] بہادل شہید کے مزار کے متصل جو کاکروں کا ٹبہ ہے وہ شہاب الدین غوری کے زمانہ کا قلعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جہاں کاکر قوم کے سپاہی تعینات تھے۔ وہ قلعہ انہی کے نام سے کاکروں کا قلعہ مشہور رہا۔ جو اب بوجہ انہدام و تباہی کاکروں کا ٹبہ کہلاتا ہے۔

ہے۔ ساڑھے تین سو سال کی تاریخ سیالکوٹ۔ اس کے سوا اور کوئی واقعہ نہیں بتاتی ؛

# سیالکوٹ شاہانِ تغلق کے عہد میں

غزنوی عہد حکومت سے لیکر خاندان تغلق کے ابتدائی ایام تک پنجاب و ہندوستان میں اسلامی حکومت کو ساڑھے تین سو سال کا جو عرصہ گذرا ہے۔ اس طویل عرصہ میں مسلمانوں کی آبادی ان ممالک میں بڑھتی دولت کی طرح ترقی کر رہی تھی۔ پشاور۔ راولپنڈی خوشاب۔ بھیرہ۔ جہلم۔ سیالکوٹ۔ لاہور۔ ملتان۔ دہلی۔ اجمیر۔ ان سب مقامات میں مسلمانوں کی معقول تعداد تھی۔ بیرونجات سے بھی بہت سے مسلمان پنجاب و ہند میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اور صوفیا و مشائخِ اسلام کے حسن عمل اور خلق محمدی سے بھی بہت سے غیر مسلمان۔ مسلمان ہو چکے تھے۔ اور ہو رہے تھے۔ باوجود اس افزونئے عروج و اقبال کے مسلمان بادشاہوں نے ان ہندو راجگاں کا راج پاٹ۔ جنہوں نے باجگزار ہونا قبول کر لیا تھا برابر قائم رکھا ہے۔ انہی باجگزاروں میں سیالکوٹ کا ہندو راجہ بھی تھا۔ لیکن جب تغلق عہد میں دار السلطنت (دہلی) میں کچھ ابتری و بدنظمی کا ظہور ہوا۔ تو راجہ سہپال[۵۱] نے جو اسوقت سیالکوٹ کا باجگزار حکمران تھا۔ اور موقعہ کی تاڑ میں تھا۔ اپنے مشیروں کے صلاح و مشورہ سے خود سری اختیار کر لی۔ کسی مبارک ساعت کیلئے منجم اور برہمن بلائے گئے۔ اور ان کو تاکید کی گئی کہ اپنے علم کے زور سے کوئی ایسا جادو بتاؤ۔ اور ایسا منتر پھونکو۔ کہ دشمن کامیاب نہ ہو سکے۔

نجومیوں اور جوتشیوں نے غور و فکر کے بعد عرض کیا۔ اگر انسانی خون قلعہ کے چارنہ گوشوں اور قلعہ کی دیواروں پر چھڑکا جائے۔ تو بہت مبارک ہے۔ اور امید قوی ہے کہ دشمن کبھی ہم پہ فتح مند نہ ہو سکے گا۔

---

۵۱۔ معلوم نہیں یہ راجہ جے پال۔ انند پال وغیرہ والیان لاہور کے خاندان سے تھا۔ یا کسی اور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بہر حال وہ ان کا ہم لقب اور ہم قوم (برہمن) ضرور رکھتا ہے

# قلعہ سیالکوٹ کی دیواروں پر ایک مُسلمان کے خُون کا چھڑکاؤ

اسلامی خون کے سوا اور کونسا انسانی خون بہ آسانی دستیاب ہو سکتا تھا۔ راجہ کے آدمیوں نے ایک غریب بڑھیا مسلمان عورت کے جوان فرزند کو پکڑا۔ اور بے قصور و بے جرم اُسکو بیدردانہ طور پر قتل کر کے اسکا خون قلعہ کی دیواروں پر چھڑکا گیا۔

میرا مرنا اُن کے گھر شادی ہوئی    خُون کے چھاپے لگ گئے دیواریں

بڑھیا ماں مامتا کی ماری روتی پیٹتی سیالکوٹ سے باہر نکل آئی۔ بیٹے کے فراق و ماتم میں شہر بشہر اور دہ بدہ پھرتی ہوئی سید امام علی[۱] لاحق بن سید حسن مکی کی خدمت میں آئی جو عہدہ منصب شاہی ترک کر کے کوہستان کانگڑہ کے نواح میں گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے تھے۔ آپ نے راجہ سہنپال کے اس ظلم و ستم کی یہ دردناک کہانی سُن کر بڑھیا سے امداد کا وعدہ کیا۔ اور دلجوئی کے کلمات زبان سے فرمائے۔

چند روز کے بعد حسن اتفاق سے سلطان فیروز شاہ[۲] تغلق کوہستان سرمور کی طرف جاتا ہوا اسی جگہ آنکلا۔ اور ڈیرہ خیمہ امام علی لاحق کے گرد و جوار میں لگا دیا۔

حضرت امام صاحب نے بادشاہ سے اس غریب بڑھیا کی الناک داستان اور راجہ کی حماقت و سنگدلی کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے امام صاحب کے سپرد ایک عظیم لشکر کر دیا۔ اور کہا کہ اس کا قرار واقعی انتظام کر کے خلق خدا کو اس کی حماقتوں سے نجات دلائیے۔

---

سلہ[۱] تاریخ سیالکوٹ صمدی یعنی "واقع زمستان حصارہ" میں لکھا ہے کہ بڑھیا مظلومہ پہلے حضرت سید یعقوب زنجانی صدر دیوان کے پاس لاہور گئی۔ انہوں نے سید علی لاحق کے نام رقعہ لکھدیا کہ بادشاہ دہلی سے کہکر مظلومہ کی دادرسی کرا دو۔ تاریخی لحاظ سے بڑھیا کی ملاقات حضرت صدر دیوان سے غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ حضرت صدر دیوان۔ حضرت شاہ حسین زنجانی کے ہمراہ جو حضرت داتا گنج بخش لاہوری کے پیر بھائی تھے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں لاہور آئے ہیں۔ اور امام علی لاحق کا واقعہ آٹھویں صدی ہجری کے وسط کا ہے۔

سلہ[۲]۔ عہد حکومت ۷۵۲ھ لغایت ۷۹۰ھ۔ وفات بعمر ۹۰ سال۔

یہ واقعہ ۷۵۵ھ[۱] کا بیان کیا جاتا ہے۔

## راجہ سیالکوٹ کے بھائی سے امام صاحب کی جنگ

حضرت امام صاحب غازیان جانباز کو ہمراہ لیکر اپنے مقام ردول سے روانہ ہوئے منزل بہ منزل جب جالندھر پہنچے تو آپ کے بھائی سیدنا امام ناصر الدین بیمار ہو گئے۔ اور چند روز علالت کے بعد یہیں انتقال فرما گئے۔ مزار آپکا شہر جالندھر میں زیارت گاہِ خلائق ہے۔ بھائی کی تجہیز و تکفین کے بعد امام صاحب سیالکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ سہنپال کا بھائی راجہ جگت پال جگت پور میں حکومت کرتا تھا۔ وہ سدِ راہ ہوا۔ راجہ جگت پال اور اس کی فوج کے ہزارہا آدمی مارے گئے۔ مسلمانوں کا بھی نقصان ہوا۔ اور سید میر باز خان المشہور سید میراں برخوردار بھی شہید ہو گئے جنکا مزار اب تک جگت پور میں موجود ہے۔

تاریخ سیالکوٹ صمدی میں لکھا ہے۔ جگت پور کا نام غازیانِ اسلام نے اس فتح کی یادگار میں پُرسرور رکھا۔ جو رفتہ رفتہ پسرور کے نام سے بدل گیا۔ لیکن بعض لوگ پسرور کو پرس رام کسی ہندو کا آباد کردہ بتاتے ہیں۔

---

[۱] سلطان فیروز شاہ تغلق اپنی طویل عمر اور اپنے طویل عہد حکومت میں پانچ مرتبہ پنجاب میں آیا ہے۔ اول ۵ صفر ۷۵۳ھ کو بطریق سیر و سیاحت کوہستانی سرحد کی طرف۔ دوم ۷۵۴ھ میں کلانور شکار کھیلنے آیا۔ جہاں عمارات بھی تعمیر کرائیں۔ سوم ۷۵۶ھ میں پھر سرحد آیا۔ اسی سنہ میں ہانسی کیطرف قلعہ فیروزہ اور شہر فیروز آباد آباد کیا۔ اور نہریں اور تالاب کھدوائے۔ چہارم ۷۶۲ھ میں سرہند آیا۔ وہاں سے نگرکوٹ کانگڑہ گیا۔ جہاں راجہ نے مع اور کوہستانی رئیسوں کے متابعت کی۔ پانچویں مرتبہ ۷۸۱ھ میں کوہ سمانہ۔ انبالہ۔ شاہ آباد اور سرحد میں آیا۔ تاریخ سیالکوٹ میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ ۷۵۵ھ میں کوہستان کانگڑہ آیا۔ اور تاریخ فرشتہ میں کوہستان سرمور لکھا ہے جو زیادہ صحیح ہے لیکن ان دونوں کوہستانوں کا زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ بلکہ باہم ملے ہوئے ہیں۔ اسلئے مصنف تاریخ سیالکوٹ کی یہ غلطی چنداں قابل لحاظ نہیں ہے۔

ایک اور شجاع اسلام سید غالب علی غازی نام مقام ہنس پور لشکر جرار لیکر گئے۔ جو ٹھاکر ہنس پال برادر زادہ راجہ سہنپال کا تعمیر کردہ تھا۔ ٹھاکر اور اس کے سرداران نامدار مارے گئے۔ سید غالب علی غازی بھی شہید ہو گئے۔ مگر آخر میں فتح مسلمانوں ہی کی ہوئی۔ اس مقام کا نام اب آدم دراز ہے۔ یہاں گنج شہیداں موجود ہے۔ اور مسلمان ان غازیان اسلام پر فاتحہ پڑھتے رہتے ہیں۔

## امام صاحب کی شہادت سیالکوٹ میں!

آخر امام سید علی لاحق کا لشکر سیالکوٹ پہنچا۔ راجہ سہنپال نے شہر اور قلعہ کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا ہوا تھا کہ اس پر فتح پانا بظاہر بڑا مشکل تھا۔ امام صاحب نے ندی ایک کے جنوب کی جانب قیام کیا۔ دو دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ مگر امام صاحب کی فوج ایک سے پار نہ ہو سکی۔ تیسرے دن کے معرکہ عظیم میں مسلمان ندی سے پار ہو کر شہر میں داخل ہو گئے۔ اور راجہ قلعہ میں محصور ہو گیا۔

کئی دنوں تک محاصرہ قائم رہا مسلمانوں نے فتح حاصل تو کر لی۔ مگر ان کے بڑے بڑے نامور افسر مارے گئے۔ خود امام صاحب زخمی ہو گئے۔ اور زخم اسقدر گہرے اور شدید نکلے۔ کہ آپ جانبر نہ ہو سکے۔

امام صاحب اور ان کے دیگر شہداء کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جہاں اور جس حالت میں کسی کا انتقال ہوا ہے۔ اسی جگہ اور اسی حالت میں اسے دفن کر دیا گیا ہے۔

قلعہ کے چاروں طرف شہدائے اسلام کے مزارات متفرق مقامات پر نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں امام صاحب کا عالیشان پختہ چونہ گچ روضہ ہے وہاں صدہا مزارات ایکدوسرے کے پہلو میں موجود ہیں۔ اور ہر شہید دوسرے شہید کے متعلق زبان حال سے کہتا ہے ؎

یوں دفن میرے ساتھ دل بیقرار ہے　　چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہے

اس کثرت مزارات سے اُن جانبازان اسلام کی غیرت و حمیت[۱] عجیب عبرت و حیرت کا نقشہ دکھاتی ہے۔

مزار مبارک پر ہر جمعرات کو مسلمان اس کثرت سے آتے ہیں کہ خاصہ میلا ہو جاتا ہے۔ عیدین کے میلوں کے علاوہ ایام محرم میں ۸ تا ۱۱ محرم اس روضۂ مبارکہ پر عظیم الشان میلہ ہوتا ہے جسمیں تمام ضلع کے لوگ آتے ہیں۔ وفات کا قطعہ تاریخ جو تاریخ سیالکوٹ میں درج ہے حسب ذیل ہے ؎

| | |
|---|---|
| چوں براہِ ذوالجلالِ ذوالکرام | داد جاں را آں علی لاحق امام |
| از پئے سالِ شہادت بانگِ حق | در رسید از لطف در گوش انام |
| از سرِ یادِ الٰہ و برتری | رفت از دنیا شہِ دارالسلام |

۴۵۷ھ

راجہ سہنپال اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ دروازہ قلعہ کے اندر جو مزار ہے وہ سید سرخ رو صاحب کا ہے۔ جو قلعہ کے عین دروازہ کے سامنے شہید ہو گئے تھے۔ غریب بڑھیا بھی اسی لڑائی میں شہید ہو گئی۔ اس کی اور بیٹے کی قبر (جسکا پتہ بعد میں لگایا گیا تھا) بعمارت پختہ قلعہ کے اندر موجود ہے۔ اِس واقعہ کے بعد سیالکوٹ کی تاریخ میں ہندو عہد حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

---

[۱] ۱۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو ایک دوست جانثارین کی تحریک سے مندرجہ ذیل اشعار لاہور میں حضرت امام صاحب کے متعلق لکھے گئے جو حضرت کے مزار پر حاضر ہو کر پڑھے گئے ؎

| | |
|---|---|
| یادگار سید مظلوم اے بیکس امام | آج حاضر ہیں مزار پاک پر تیرے غلام |
| اے فدائے دین حق اے مرجع ہر خاص و عام | پھونکدے کانوں میں ان کے بھی کوئی ایسا کلام |
| سر چلا جائے نہ جانے پائے دامن دین کا | دیکھتا رہ جائے استقلال دشمن دین کا |
| ناز کر قسمت پہ اپنی اے زمینِ سیالکوٹ | تجھ میں ہے ایسا دفینہ جس پہ اک عالم ہے لوٹ |
| تیرے دم سے نام کچھ اسلام کا باقی ہے یاں | تیری برکت سے ہمارا شہر ہے رشک جناں |
| مٹ گئے خود پر دیا مٹنے نہ مذہب کا نشاں | ڈھیر قبروں کے نہیں غیرت کے ہیں گنج نہاں |
| میں چراغ دین ہوں بجھنا نہیں میرا روا | جس سے روشن دین ہو وہ روشنی کیجیو عطا |

# سیالکوٹ اور سلطان حسن شاہ فرمانروائے کشمیر

کشمیر جو آج تمام جہان کی بُرائی اور بزدلی کا مخزن بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے باشندوں کو دیکھکر اُن کے دل کی تمام کیفیت بلکہ ملک کشمیر کی تمام واماندگی و درماندگی پیش نظر ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ میں اس کی فتوحات کا پرچم حدود کشمیر سے سدہا میل دُور تک لہراتا رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس کا ہر فرد یہی پھرن اور یہی لمبے درویشانہ کُرتے پہن کر ع ند اسپہ دوانم بہ میدان جنگ[1] کا نعرہ لگاتے ہوئے کہتا تھا ؎

کسے را بمن تاب ناورد گو      فراخ ہست میداں ولے مرد کو

کسے کو تواند بر آمد بہ صف      کہ تیغم ہنوز ہست عریاں بکف

بہ دیدن شود خصم را زہرہ آب      کجا زہرہ دارد کہ آرد جواب

آج جموں کے فرمانروا کشمیر کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں پر جس "انصاف و مساوات" اور "ہمدردی و بے تعصبی" سے حکومت کر رہے ہیں۔ اخبار بین حضرات اور اُن اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہے جو ہر سال کشمیریوں کے جمِ غفیر کو پنجاب کے تمام بڑے بڑے شہروں میں محنت مزدوری کرتے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں۔ اور پھر ان کے ملک کی طویل داستانِ المناک بھی سُنتے ہیں۔ جموں و کشمیر کے انہی فرمانرواؤں کے ایک بزرگ راجہ عجیب دیو والئے جموں کو جب تاتار خاں حاکم لاہور نے سخت تنگ کیا اور اس کو اپنی جان و آبرو بچتی نظر نہ آئی تو اس نے اِسی "بزدل و کم ہمت" کشمیر کے مسلمان فرمانروا سلطان حسن شاہ کو اپنی مدد و حمایت کیلئے لکھا۔ سلطان حسن شاہ خود تو نہ آسکا۔ مگر اُس

[1] ملا حمید اللہ اسلام آبادی کاشمیری کا اکبر نامہ ملاحظہ کیجیے۔ یہ اکبر نامہ فردوسی کے شاہنامہ کی طرز پر ہے۔ حمید۔ فردوسی پر چوٹ کرتا ہوا کہتا ہے ؎ ازیں پیش گر نامہا گفتہ اند ٭ بسے گوہر سفتہ اند ٭ نہ کردم من ایں داستاں بہر زر ٭ کہ بہر خزف کس نریزد گہر ٭ فروشم گہر قصدم سود نیست ٭ نگاہم سوئے دست محمود نیست ٭ پھر اپنی سخن گوئی و سخن ریزی کی داد فردوسی طوسی ہی سے لیتا ہے اور کہتا ہے ؎ بگند برمن از گنبد آبنوس ٭ ہزاراں آفریں روح دانائے طوس ٭ یہ اکبر نامہ ۱۲۶۰ھ میں تصنیف ہوا ہے اور ابتک غیر مطبوع ہے۔

نے اپنا ایک نامور افسر ملک تازی بٹ ایک جرار فوج کے ہمراہ راجوری کے رستے جموں بھیجا۔ تاتار خاں کو بھی خبر ہوئی۔ وہ بھی مقابلہ کیلئے لاہور سے باہر نکلا۔ سیالکوٹ کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ جنگ عظیم میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تاتار خاں نے جب دیکھا کہ اس کی فوج گاجر مولی کی طرح کٹی جارہی ہے۔ تو بے حوصلہ ہوکر اور جان بچاکر بھاگ گیا۔ تازی بٹ مظفر و منصور شہر میں داخل ہوا۔ اور اسکی فوج نے اس قدر لوٹ شہر میں مچائی کہ سیالکوٹ جو اسقدر آباد و بارونق شہر تھا اجاڑ نگر ہو گیا۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے۔ "تازی بٹ نے تاتار خاں کو شکست دے کر سیالکوٹ کو خراب اور ویران کر دیا"۔ یہ واقعہ ۸۸۰ھ سے ۸۹۲ھ تک کے درمیان ہوا ہے کیونکہ یہی زمانہ سلطان حسن شاہ کی حکومت کا تھا۔

## سیالکوٹ عہد بابری میں

ہندوستان اور پنجاب میں خاندان لودھی کی حکومت تھی۔ کہ ۹۲۶ھ میں ظہیر الدین بابر تسخیر لاہور کے لئے کابل سے باہر نکلا۔ اور سیدھا سیالکوٹ پہنچا۔ شہر کے لوگوں نے بعجز تمام اپنے قائم مقام اور سرکردہ و منتخب لوگ بابر کے حضور میں بھیجے اور اطاعت اختیار کر کے جان کی امان اور مال و ناموس کی حفاظت چاہی۔ بابر نے اہل سیالکوٹ کی التماس پذیرا کی۔ اور اپنی فوجوں کو اہل شہر کی ایذادہی اور لوٹ مار سے بسختی تمام باز رکھا۔ ۹۳۰ھ میں بابر ابراہیم لودھی کے رشتہ داروں بالخصوص حاکم پنجاب دولت خاں لودھی کی دعوت پر چوتھی مرتبہ وارد ہند ہوتا ہے۔ اور سیالکوٹ لاہور اور دیپال پور تک کہ اس زمانہ میں نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ پہنچتا ہے۔ بابر نے ہر جگہ اپنے آدمی مقرر کئے۔ سیالکوٹ کی حکومت خسرو کوکلتاش۔ اور لاہور کی حکومت امیر عبدالعزیز کے سپرد کر کے آپ واپس کابل چلا گیا۔

دولت خاں لودھی نے بابر کو اپنے ملک میں دعوت دیکر جو حماقت کی تھی۔ بابر کے جانے کے بعد اس پر اسکو ندامت آئی۔ اور اس نے تلافی مافات کیلئے پانچ ہزار

شروانی افغان سواروں کے ساتھ خسرو کوکلتاش پر حملہ کر دیا۔ خسرو کو بھی دولت خان کے منصوبوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس نے بابر کے پاس ایسے آدمیوں کے ہاتھ لودھیوں کے دغا و فریب کی اطلاع بھیجی جو ہوا کی طرح گئے اور بگولے کی طرح ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں بابر کو ہمراہ لیکر آئے۔

امیر عبدالعزیز لاہور کا بابری گورنر اور دیگر امرائے بابری مغلوں کی ایک جرار فوج لیکر خسرو کوکلتاش حاکم سیالکوٹ کی مدد کو گئے۔

سلطان علاؤالدین[۵] لودھی جو ابراہیم لودھی بادشاہ ہند سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ اور خواجہ حسین دیوان لاہور جو خزانہ لاہور کا افسر اعلیٰ تھا۔ اور کئی امراء بابر کے آنے کی خبر سُنکر سیالکوٹ آ گئے۔

۱۴ ربیع الاوّل ۹۳۲ھ جمعہ کا دن تھا کہ بابر اپنے بیٹے شاہزادہ ہمایوں اور دس ہزار فوج کے ساتھ سیالکوٹ میں داخل ہوا۔ اس نے سیالکوٹ آ کر اہل لاہور کو تو یہ پیغام بھیجا کہ تم لوگ اگر امرائے بابر کی مخاصمت سے باز رہو گے۔ تو تم کو کسی طرح کی تکلیف نہ دیجائے گی۔ اور اپنے آدمیوں کو جو لاہور میں تھے۔ کہلا بھیجا کہ وہ سیالکوٹ یا پُرسرور (پسرور) آ کر میری سپاہ کے ساتھ شامل ہو جائیں تا کہ ہماری جمعیت جگہ جگہ منتشر نہ ہو۔

---

سلہ ۵۔ علاؤالدین کو عالم خاں بھی کہتے تھے۔ یہ سلطان بہلول لودھی کا بیٹا۔ اور سلطان ابراہیم لودھی کا چچا تھا۔ مگر بھتیجے کے سلوک سے جہاں اور امرائے لودھی نالاں تھے۔ یہ بھی فریاد کناں رہتا تھا۔ تاریخ ذکار اللہ میں تو یہ لکھا ہے کہ سلطان علاؤالدین بابر کے سیالکوٹ آنے کی خبر سُنکر لاہور سے اس کے پاس آ گیا۔ مگر مصنف حیات لودھی اپنی کتاب کے حصہ سوم صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں کہ عالم خاں عرف سلطان علاؤالدین نواح سرہند میں ابراہیم سے شکست کھا کر بابر کے پاس کابل چلا گیا تھا۔ بابر نے اپنی روانگی لاہور سے پیشتر ۹۳۲ھ میں اسکو اپنے لشکر اور اُمراء کے ساتھ ہندوستان بھیجا۔ وہ سیالکوٹ آیا۔ اور نواح کے رئیسوں کو مطیع کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ اور یہاں سے ۴۰ ہزار کا لشکر لیکر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اور ابراہیم سے شکست کھا کر واپس آیا۔ اسی واپسی میں وہ سیالکوٹ میں بابر سے ملا۔

بابر پسرور میں تھا کہ اسکو اطلاع ملی کہ غازی خاں نے تیس چالیس ہزار فوج جمع کی ہے۔ اور اس کے بڈھے باپ (دولت خاں لودھی) نے ایک کی بجائے دو تلواریں کمر میں کس لی ہیں۔ بابر کو لودھیوں کی خانہ جنگیوں کا حال معلوم تھا۔ اسلئے باوجود غیر ملک میں اپنی تھوڑی سی فوج رکھنے کے بھی وہ ہراساں نہ ہوا۔ آخر اس نے نہ صرف ان باپ بیٹوں کا استیصال کیا۔ بلکہ ۱۸ رجب سنہ ۹۳۲ھ مطابق سنہ ۱۵۲۵ء روز جمعہ کو سلطان ابراہیم لودھی پر بھی فتح پائی۔ اور ہندوستان کی عظیم مملکت کا بادشاہ ہوگیا۔ اور سیالکوٹ کی حکومت بدستور خسرو کوکلتاش کے سپرد رہی۔

## سلیم شاہ سوری سیالکوٹ میں

سنہ ۹۳۲ھ عہد بابری سے لیکر بیس سال تک سیالکوٹ کے حالات پر پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ سنہ ۹۵۲ھ سے سنہ ۹۵۵ھ مطابق سنہ ۱۵۵۲ء کے درمیان سلیم شاہ سوری بن شیر شاہ سوری کے زمانہ میں پھر سیالکوٹ ایک مرتبہ صفحات تاریخ پر اس موقعہ پر نظر آتا ہے جب نیازی پٹھان سوری افغانوں سے شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ اور سلیم شاہ انکا تعاقب کرتا ہوا سیالکوٹ تک آ پہنچتا ہے۔ اسی جگہ نیازیوں کا سب سے بڑا سرغنہ ہیبت خاں اپنی ماں اور فرزندوں کے سلیم شاہ کے پاس عفو تقصیرات کیلئے پیش ہوتا ہے۔ سلیم شاہ نے کئی دن تک نزول اجلال سیالکوٹ میں رکھا۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں میاں وارث کشمیری سیالکوٹ میں ایک نامور بزرگ ہوئے ہے جو مالگذار اور تعلقدار بھی تھا۔ اور جس کے حسن انتظام سے سب لوگ خوش تھے۔

## سیالکوٹ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں

سنہ ۱۵۵۶ء تا نہایت سنہ ۱۶۰۵ء

اکبر کے عہد میں ہندوستان کی تقسیم صوبوں کے علاوہ بادئیوں پر بھی تھی

سیالکوٹ بھی ایک باؤنی کا صدر مقام تھا۔ جسکے ماتحت علاوہ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے ۵۲ بڑے بڑے دیہات بھی تھے۔ یہی ۵۲ دیہات ایک باؤنی کہلاتے تھے جموں[۱]۔ ایمن آباد[۲]۔ سوہدرہ[۳]۔ شیخوپورہ[۴] یہ سب مقامات سیالکوٹ کے ماتحت تھے

اُس زمانہ میں دریائے چناب کے پار سے ڈاکو اور رہزن آتے تھے اور چھاپہ مار کر چلے جاتے تھے۔ حکام سیالکوٹ جن کے ماتحت وہ علاقہ تھا۔ ان کے انتظام سے عاجز تھے۔ اکبر جب سنہ ۹۹۴ھ کے بعد سفر کشمیر سے واپس آیا۔ اور بھمبر کے قرب وجوار کے لوگوں نے گجروں کی لوٹ مار کی شکایت کی تو اکبر نے گجرات کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا۔ جہاں سیالکوٹ سے بھی بہت لوگ آکر آباد ہوئے اور اس گاؤں کو جسمیں گجروں کی آبادی دیگر تمام اقوام سے زیادہ تھی سیالکوٹ سے بالکل الگ کر دیا۔

---

۱۔ جموں اس زمانہ میں تو ایک بے حقیقت گاؤں سا تھا۔ اب اس کی آبادی ۳۳ ہزار کے قریب ہے مہاراجہ جموں وکشمیر کا گرمائی صدر مقام ہے + ۲۔ ریاست جموں وکشمیر کے نامور وزراء دیوان امیچند دیوان جوالا سہائے۔ دیوان کرپا رام۔ دیوان گوبند سہائے۔ دیوان اننت رام و دیوان امرناتھ اسی ایمن آباد کے رہنے والے تھے۔ اب اس اعلیٰ خاندان سے صرف دیوان دھنپت رائے جاگیردار جج دیوان لچھمن داس کے بیٹے ہیں۔ باقی ہیں + ۳۔ عہد شاہجہان کا مشہور ہندو شاعر چندر بھان تخلص برہمن اسی سوہدرہ کا رہنے والا تھا۔ اسکا ایک مشہور شعر ہے ۔ ببیں کرامت بتخانہ مرا اے شیخ ۔ کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد + سوہدرہ بہت پرانا قصبہ ہے۔ اب بھی اسمیں پرانے آثار نظر آتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمود غزنوی کے غلام ایاز نے اسکو آباد کیا تھا۔ جو لاہور کا نائب حاکم بھی رہا ہے اور جسکا مقبرہ لاہور میں اب تک موجود ہے +

۴۔ شیخوپورہ اکبر کے زمانہ میں سلیم کے ابتدائی نام شیخو بابا پر آباد ہوا۔ سلیم نے بادشاہ ہو کر اس کا نام جہانگیر آباد رکھا۔ مگر وہ مشہور نہ ہو سکا۔ رانی جنداں اسی شیخوپورہ میں قید رہی تھی اب یہ مقام معہ اپنے وسیع قلعہ کے راجہ فتح سنگھ رئیس لاہور کی جاگیر میں ہے۔ شیخوپورہ چند سالوں سے ضلع کا صدر مقام ہو گیا ہے۔ اور اس کی رونق وآبادی بہت بڑھ گئی ہے +

اسی سفر میں اکبر سیالکوٹ بھی آیا۔ قلعہ کی عمارت دیکھی۔ امام علی لاحق اور دیگر بزرگانِ دین کے مقبروں اور مزاروں پر گیا۔ اسی زمانہ میں سیالکوٹ سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک بزرگ شاہ محمد حمزہ غوث متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کہ عجیب و غریب طبیعت لیکر آیا تھا۔ خود ان سے ملنے گیا۔ ملکر بہت خوش ہوا۔ ان کے خدام اور لنگر عام کے لیئے چند گاؤں وقف کر دیئے۔ اکبر نے راجہ مان سنگھ کو سیالکوٹ جاگیر میں دیدیا۔ مان سنگھ نے خوب رعایا پروری سے کام لیا۔ شاہ حمزہ غوث کی حیات میں اُن کی عبادت کا چلہ بعمارت پختہ تعمیر کرایا۔ اور جب وہ وفات پا گیئے تو اُن کے مزار کی تمام عمارت بھی خود بنوائی۔

اُس زمانہ میں کشمیر میں شیعہ چک بادشاہ سُنی مسلمانوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ اس لیئے کشمیر کے اکثر سُنی مسلمان ترک وطن کر کے سیالکوٹ اور دیگر مقامات پر آ گئے تھے۔ اور یہاں عموماً کاغذ سازی کا کام کرتے تھے۔ مان سنگھ نے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کاغذ سازوں کو پیشگی روپیہ بطور امداد دیا۔ جس سے انہوں نے اپنے فن کو خوب وسعت و ترقی دی۔ اسی زمانہ میں اسی سرپرستی کی وجہ سے کاغذ کا نام "مان سنگھیہ کاغذ" مشہور ہو گیا۔

اکبر ہی کے زمانہ میں مولوی کمال الدین کاشمیری اُستاد مولوی عبدالحکیم اپنے وطن کشمیر سے سیالکوٹ آئے۔ اور میاں عارف کی مسجد میں امام مقرر ہو کر لوگوں کو درس تدریس دینے لگے۔

اکبر کے زمانہ میں تانبہ اور سونے کے سکے اکثر مقامات میں بنائے جاتے تھے۔ تانبہ کی ٹکسال ۵۸ مقامات پر تھی۔ جن میں ایک ٹکسال سیالکوٹ میں بھی تھی۔

## سیالکوٹ عہدِ جہانگیری میں

### ۱۶۰۵ء لغایت ۱۶۲۷ء

جہانگیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کا جاگیردار اور فوجدار (کمانڈنگ انسر)

خان خاناں صفدر خاں تھا۔ جس نے قلعہ اور قلعہ کے برجوں کو از سرِ نو تعمیر کرا کے اُسمیں اس قسم کے عجیب و حیرت انگیز محلات تعمیر کرائے کہ چشم فلک نے بھی بہت کم دیکھے ہونگے۔ ان عمارات میں رنگ محل اور شیش محل نہایت لاجواب عمارتیں تھیں۔ ملازمانِ جنگی و ملکی کے لئے الگ مکانات تعمیر ہوئے۔ غرض قلعہ بجائے خود ایک اچھا خاصہ شہر تھا۔

صفدر خاں کی تقلید میں رؤسائے شہر نے بھی عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں جہانگیر نے بھی مان سنگھ کی طرح کاغذ سازوں کی سرپرستی کی۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے کاغذ کا نام "جہانگیری کاغذ" قرار پایا۔ یہ کاغذ عام کتب کے علاوہ مذہبی کتابوں کی کتابت میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ کاغذ کی پائداری اور خوشنمائی کی وجہ سے ساہوکار لوگ اپنی بہیاں بھی اِسی کاغذ پر بناتے تھے۔ جو کاغذ ادنےٰ یا متوسط درجہ کا ہوتا تھا وہ سرکاری کاغذات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

جہانگیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کی آبادی و رونق بہت بڑھ گئی۔ مکانات اور باغات عالیشان تعمیر ہو گئے۔ مرفع الحالی میں لوگوں نے خوشدلی کے سامان پیدا کر دیئے۔ علماء و فضلاء کی قدردانی میں جہانگیر نے خاص حصہ لیا۔ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کو سب سے پہلے جہانگیر نے ہی جاگیر عطا کی تھی۔

## سیالکوٹ شاہجہان کے زمانہ میں

۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء مطابق ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ

شاہجہان کے زمانہ میں سیالکوٹ کے آٹھ دروازے تھے۔ اور ہر دروازہ پر چند فوجی سپاہی تعینات ٭٭ تھے۔ دروازوں کے نام معہ ان کے فوجی کمانڈروں کے حسبِ ذیل ہیں۔ کشمیری دروازہ (بماتحتی سردار کمال خاں لودھی) گجراتی دروازہ (بماتحتی احمد خاں کرانی) مغربی دروازہ (مقصود خاں شیروانی) لاہوری دروازہ یعقوب خاں شیروانی) دہلی دروازہ (نصر اللہ خاں شیروانی) مشرقی دروازہ

(رحیم خاں ہلوانی) جموں والا دروازہ (بہ ماتحتی زبردست خاں) موری دروازہ (بہ ماتحتی افضل خاں شیروانی)۔ آٹھ دروازوں میں سے چار دروازوں پر صرف شیروانی پٹھانوں کی پہرہ داری اس بات کی علامت ہے کہ یہ لوگ جو ۹۳۲ھ میں بعہد بابر مغلوں کے جانی دشمن تھے۔ اور سیالکوٹ کو بابر سے چھیننے کیلئے حملہ آور ہوئے تھے۔ ایکسو سال کے بعد ۱۰۳۷ھ میں بعہد شاہجہان حکومت پنجاب کی مشین کا ایک قیمتی پُرزہ اور سیالکوٹ کو دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا ایک زبردست ذریعہ تھے۔ سیالکوٹ میں اب بھی شیروانی پٹھانوں کی ایک معقول تعداد ہے۔

مغلیہ عہد حکومت میں مالگذاری کی رقم شاہی آمدنی کا بہت بڑا بلکہ سب سے زیادہ ذریعہ تھی۔ اکبر سے پہلے جو بادشاہ ہندوستان میں ہوئے ہیں وہ ½ حصہ پیداوار کا لیا کرتے تھے اور اکبر تیسرا حصہ لیا کرتا تھا۔ شاہجہان کے عہد میں عام محصولات کی تو خبر نہیں۔ لیکن تاریخ سیالکوٹ یعنی وقائع زمستان حصار سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کے ایام حکومت میں سیالکوٹ میں فی بیگہ صرف چھ پیسے (۱۰/۰) لگان الاضی تھا! اور باغات کی پیداوار پر تو کسی قسم کا کوئی محصول نہ تھا۔ اسلئے کاشت اراضی۔ باغات اور عمارات دِلکش کی ء ء ء ء تعمیر سے سیالکوٹ بہشت کا ایک ٹکڑہ معلوم ہوتا تھا۔

شاہجہان کے عہد میں مائی بھیلاں کے نام سے ایک نیک بخت ہندو عورت سیالکوٹ میں گذری ہے۔ جو بغیر تمیز مذہب و ملت ہر روز تین چار روپئے کے پیسے فقراء۔ غرباء اور معصوم لڑکوں میں تقسیم کرتی تھی۔ مائی بھیلاں[۱] کو ایک دن معلوم ہوا کہ مسجد محلہ خراسیاں جہاں لڑکے پڑھتے ہیں ایسی شکستہ اور خراب حال

---

[۱] جہاں آجکل ٹاننٹن پارک ہے وہاں اس نیک بخت و مخیر عورت کا ایک باغ بھی تھا۔ جس کے مشرق کی جانب صفدر خاں کے غلام پنوں خاں نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا۔ وہ تالاب تو اب کہیں نہیں۔ البتہ اس مقام کا نام اب تک "پنوں سر" مشہور ہے ؛

ہے کہ بارش کے دنوں میں لڑکوں کو قرآن اور سیپارے سنبھالنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ مائی بیلاں نے مسجد کی مرمت کے لئے پڑاوہ والوں کو کچھ روپے دیئے۔ میاں اسلام یار ایک وڈھیرہ رئیس کو جب خبر ہوئی تو اس کی حمیت نے گوارا نہ کیا۔ کہ میں اس ثواب سے محروم رہوں۔ مائی بیلاں کو بہت کچھ کہا سنا۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مسجد تو میاں اسلام یار بنوائے اور کنواں مائی بیلاں تعمیر کرائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مسجد اور کنواں اب تک محلہ خراسیاں میں آباد ہیں۔

## سیالکوٹ عالمگیری عہد میں

سنہ ۱۶۵۸ء لغایت سنہ ۱۷۰۷ء

عالمگیر کے زمانہ میں بھی سیالکوٹ روز بروز رونق حاصل کرتا رہا۔ ملک میں امن و امان تھا۔ تجارت کو کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں مدرسے اور کتب خانے موجود تھے۔ اور علم و ہنر کا ہر جگہ چرچا تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں سیالکوٹ کا ایک صاحب حشمت ہندو وڈھیرہ دہلی جا کر مسلمان ہو گیا تھا۔ جس کا نام رحمت اللہ رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس کو جاگیر و منصب عطا کر کے سیالکوٹ کا پرگنہ دار مقرر کیا۔ شیخ رحمت اللہ نے کئی عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔ شہر کے عین درمیان بہت اونچی کرسی بنا کر شاہانہ طرز پر ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہی مسجد اب دو دروازہ والی مسجد کہلاتی ہے۔

یہ مسجد محمد فرخ سیر کے زمانہ حکومت میں تکمیل کو پہنچی۔ قطعہ تاریخ مسجد کے دروازہ پر جو سیالکوٹ کے سب سے بڑے بازار میں ہے۔ حسب ذیل درج ہے:

ہمچو کعبہ شد کہ ایں مسجد بناء … آسماں گفتہ کہ احسن انتہاء

سال تاریخش چو جستم عقل گفت … رحمت اللہ کرد ایں مسجد بناء

۱۱۳۹ھ

۱۲۶۹ھ میں بزمانہ منشی بشارت علی تحصیلدار اعلیٰ پیمانہ پر اس مسجد کی مرمت ہوئی۔ بن باجوہ (ضلع سیالکوٹ) کے ایک عالم باعمل مولوی شیر محمد مرحوم امام مسجد بنائے گئے۔ جن کے فیض تدریس سے اکثر لوگ بہرہ ور ہوئے۔ تاریخ مرمت کا قطعہ حسب ذیل ہے ؎

چوں بشارت علی نیک نہاد ۔۔۔ خانۂ کعبہ ساخت نو بنیاد
خواست نادر زسال تاریخش ۔۔۔ گفتمش خانۂ خدا آباد

اس مسجد کی دوسری مرمت ۱۳۰۱ھ یا اس کے قریب کسی سال میں آغا محمد شہباز خاں[۱] رئیس سیالکوٹ نے بہ لاگت کثیر کرائی تھی۔

عالمگیر کے عہد حکومت میں سیالکوٹ کا علمی شان و شکوہ دار الخلافہ اور عہد مغلیہ کے دوسرے نامور علمی شہروں سے کم نہ تھا۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی جنکی تصنیفات ہندوستان سے لیکر قسطنطنیہ تک پھیلی ہوئی ہیں کے صاحبزادہ ملا عبد اللہ اپنے والد ماجد کی جگہ اپنے مدرسے کے قائم مقام ہوئے۔ جنہوں نے اپنے علم و فضل کی برکت سے اپنے باپ کے بعد بھی سیالکوٹ کے علمی مرکزیت کے نشان کو مٹنے نہ دیا۔ جیسا کہ صاحب خلاصتہ التاریخ[۲] مولانا عبد اللہ اور ان کے والد مولوی عبد الحکیم کے متعلق لکھتے ہیں :۔ در عہد خلافت شاہجہان بادشاہ افضل العلماء مظاہر طبع مستقیم مولوی عبد الحکیم کہ بحر مواج فضل و کمال و در فضائل و افادات بیہمال بود۔ بیشتر

---

۱؎ آغا محمد شہباز خاں سیالکوٹ کے ایک نامور رئیس گذرے ہیں۔ انکی سخاوت و فیاضی سے اہل شہر بہت مستفیض ہوتے تھے۔ انکا عالیشان مکان جو ریلوے سٹیشن کے متصل راجہ بازار کے کنارہ پر اور دیوار قلعہ کے نیچے ہے اب تک ان کے تموّل کا اظہار کر رہا ہے۔ آغا محمد باقر خاں جنہوں نے ترک موالات کے سلسلے میں آنریری مجسٹریٹی ترک کر دی۔ اور آغا محمد صفدر خاں بی۔ اے جنہوں نے اسی سلسلہ میں وکالت ترک کر دی ہے اور جو آجکل حب وطن ہونے کے جرم میں سزائے قید بھگت رہے ہیں۔ آغا محمد شہباز خاں کے ذریات و باقیات الصالحات میں سے ہیں۔

۲؎ منشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی عہد عالمگیری۔ سنہ تالیف ۱۱۱۸ھ صفحہ ۸۱۔

مروّج علوم گردید و بعضے بر کتب حاشیہ تصنیف نمودہ محلل معانی مشکلہ گردید و طلبہ علم از ممالک دور و نزدیک در مدرسہ متبرکہ ایشاں رسیدہ فیضیاب شدند و بعد رحلت ایشاں مقتدائے اہل اللہ رہنمائے خلق اللہ مولوی عبداللہ خلف[۱] دویمی آں مغفور رونق افزائے مدرسہ و رہنمائے طلبہ علم اشتغال و رزیدہ فضائل معنوی را با علوم ظاہری ہمدوش بود و بیشی را با فضیلت ہم آغوش گردانیدہ۔ از افزونی حسن اخلاق و رہنموئی طبقات خلائق اہل بزرگ را امام وقت گفتند و در ۳۶ عالمگیری بعالم جاوید مے شتافتہ"

صاحب خلاصتہ التواریخ نے جو ایک ہندو بزرگ ہیں اور جنکی حیات میں مولوی عبداللہ خلف مولوی عبدالحکیم نے انتقال کیا ہے۔ اور جنہوں نے عالمگیر کی چالیس سالہ حکومت کے دوران میں اپنی تاریخ شروع کی ہے[۲] سیالکوٹ کی اس صنعت و حرفت کا ذکر کیا ہے جس نے عہد عالمگیری میں اسکو چار دانگ میں مشہور کر رکھا تھا۔ چنانچہ صاحب خلاصتہ التواریخ سیالکوٹ کے مانسنگھی خلاصہ جہانگیری اور حریری کاغذوں کا ذکر کرنے کے بعد جن کے متعلق انکی چشمدید رائے ہے کہ وہ سفید و صفا اور دیرپا ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "کار چکین از ابریشم و کلابتون از قسم باخنہ و چہرہ نقوطہ و سوزنی و عدشقہ و دستارخوان و خوانپوش و رآوی بوٹہ دار و کلابتون موزون مے شود و ہر سال قریب لک روپیہ از کار چکین دوزی بہ بیع و شرا مے آید و در اطراف گیتی مے رود۔ و نیز جمدہر و کٹاری و برچھی بہتر مے کنند۔"

آبادی کے متعلق لکھا ہے۔ "در زمان سابق دارالحکومت ولایت پنجاب بود و دو سہ کروہ آبادی داشت اکنوں[۲] از جمیع قصبات ایں صوبہ در آبادی افزون است۔"

---

[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحکیم کے ایک سے زیادہ فرزند تھے۔ اور مولوی عبداللہ چونکہ دوسرا بیٹا تھا اسلیئے ایک ان سے بڑا بھی تھا۔ [۲] یعنی عالمگیر کے چالیسویں سال جلوس یا ۱۱۰۸ھ میں جو تاریخ کی تصنیف

# بہادر شاہ شاہ عالم اور سیالکوٹ

عالمگیر اورنگ زیب کے بعد محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ ۱۷۰۷ء میں تخت نشین ہؤا۔ ابتداء میں محمد اعظم اور شاہزادہ کام بخش اور شاہ عالم میں خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ انہی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھا کر سکھ جو کوہستانی حصّوں میں چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑوں سے نکل کر گرد و نواح میں لوٹ مار کرنے لگے۔ اکثر دیہات اور قصبے ویران ہو گئے۔ مگر سیالکوٹ مغلوں اور پٹھانوں کی زبردست فوجوں اور رعایا کی وفاداری کی وجہ سے بالکل محفوظ رہا۔ بہادر شاہ نے بھائیوں کی خانہ جنگیوں سے فارغ ہو کر اہل سیالکوٹ کی جاگیریں برقرار رکھیں۔ اور اُنکے منصبوں میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ بہادر شاہ نے بادشاہ ہو کر اپنی حکومت کا سارا زمانہ قریباً لاہور ہی میں بسر کیا ہے۔ ۱۷۱۲ء مطابق ۱۱۲۹ھ میں اُس نے لاہور ہی میں وفات پائی۔ اس کے عہد میں تین بزرگ سیالکوٹ میں بہت مشہور گذرے ہیں (۱)۔ شاہ درتن ابدال جن کا مقبرہ عیدگاہ کے متصل ہے۔ (۲) شاہ خاکی ولی جنکا مزار رنگپور کے متصل واقع ہے۔ (۳) شاہ مونگا ولی۔ ان کا مقبرہ بھی عیدگاہ کے قریب ہی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ایک سکھ وزیر سنگھ ساکنہ راجہ گھماؤں تحصیل ڈسکہ نے اپنے حسن اعتقاد سے اس مقبرہ کی عمارت بنوادی تھی*

## فرخ سیر کا عہد اور سیالکوٹ

۱۷۱۲ء میں جبکہ باہمی خانہ جنگیوں اور اُمرائے دربار کی سازشوں سے سلطنت روز بروز کمزور ہو رہی تھی فرخ سیر[1] دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں بھی سکھوں نے جھاڑیوں اور جنگلوں سے سر باہر نکالا۔ لیکن اُس زمانہ میں نواب ذکریا خاں۔ خان بہادر لاہور کا صوبیدار تھا۔ اُس نے ان کی شورش و

---

[1] عظیم الشان کا بیٹا۔ بہادر شاہ عالم کا پوتا اور اورنگ زیب کا پڑپوتا تھا۔ ۱۷۱۹ء میں معزول ہو گیا۔

فتنہ انگیزی سے سیالکوٹ کو محفوظ رکھا۔ اور انتظام کو زیادہ مستحکم اور ہر پرگنہ کو زیادہ محفوظ بنانے کیلئے اُس نے پسرور اور ظفروال کے محال سیالکوٹ سے علیحدہ کر دیئے۔

فرخ سیئر کے زمانہ میں سیالکوٹ کے حسب ذیل چار محال تھے:۔ گکھڑ۔ سمبڑیال مراکیوال۔ بھاگووال۔ پرگنہ سیالکوٹ کی کل جمع اس زمانہ میں دس لاکھ ۸۳ ہزار ۲۱ روپیہ تھی۔ ایک لاکھ ۸۰ ہزار کی جاگیر اور معافیات نکال کر نو لاکھ روپیہ سے کچھ زیادہ رقم خالصہ کی تھی۔ اسی وجہ سے اُس زمانہ میں سیالکوٹ نولکھا پرگنہ کہلاتا تھا ویرانہ مزروعہ اور باغات پر کوئی مالیہ نہ تھا۔ اور سٹرکانہ اور پٹوار لینے کا بھی اس زمانہ میں کوئی دستور نہ تھا۔

## حقیقت رائے کا مشہور واقعہ

فرخ سیئر کے زمانہ میں جو واقعہ سب سے زیادہ مشہور اور اہم گذرا ہے وہ سیالکوٹ کے ایک کھتری باغ مل پوری کے نو عمر لڑکے حقیقت رائے کے قتل کا ہے۔ جسکی تفصیل اس طرح بیان کیجاتی ہے کہ کسی بات پر حقیقت رائے اور ایک مسلمان لڑکے میں جو اسکا ہم درس یا ہم مکتب بیان کیا جاتا ہے۔ تکرار ہو گئی۔ گالی گلوچ کے بعد نوبت زدو کوب تک پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقت رائے نے مسلمانوں کے مذہب اور بانئے مذہب کو بھی گالیاں دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ وہ مدرسہ مسجد اور مسجد کے کنوئیں میں نجاست اور گندگی ڈالتا رہتا ہے مقدمہ قائم ہونے پر سیالکوٹ کے محکمہ قضا نے اس پر فرد جرم لگا کر اُسے عدالت العالیہ لاہور میں بھجوا دیا۔

حقیقت رائے کے والدین اور دیگر ہندوؤں بلکہ کئی ایک مسلمانوں نے بھی حقیقت رائے کے بچانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ نواب خان بہادر ذکریا خاں لاہور کا گورنر تھا۔ اسپر بھی شرفائے لاہور و سیالکوٹ کی سفارشوں کا بڑا

اثر ہوا۔ قاضی کو کہا۔ کافی سزا اوسکو مل چکی ہے۔ اگر کوئی صورت اس ناتجربہ کار نوعمر لڑکے کی رہائی کی ہو سکتی ہے تو نکالو۔ لیکن قاضی نے اپنے اختیارات کے سامنے گورنر کی بھی ایک نہ سُنی۔ آخر بڑا مہربان ہوا۔ تو یہ کہا۔ اگر حقیقت رائے مسلمان ہو جائے تو بچ سکتا ہے۔

حقیقت رائے گو ابھی بالکل نوعمر تھا۔ لیکن اپنی بے گناہی پر چونکہ اُسے کامل یقین تھا اِسلئے اُس نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا۔ اور آخر قاضی کے فتوے کے مطابق لاہور میں اُسے پھانسی کی سزا دیگئی۔ اور لاش اُس کے وارثوں کے حوالے کر دی گئی۔

حقیقت رائے کے قتل پر ہندوؤں نے بڑا ماتم کیا۔ اس کی سمادھ دو جگہ بنی۔ لاہور اور سیالکوٹ۔ دونوں جگہ حقیقت رائے کی سمادھ پر بہت بڑا میلہ ہوتا ہے لاہور میں بسنت کا مشہور بارونق میلا اسی سمادھ پر جو موضع چاہ میراں اور بھوگیوال کے درمیان ہے۔ ہوتا ہے۔ لوگ پتنگ بازی کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی بعض ٹولیاں بھجن بھی گاتی ہیں۔ اور سمادھ کے متصل حقیقت رائے کے استقلال اور اس کی ثابت قدمی و حُریت پر لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ اس میلہ میں عورتیں بھی بکثرت ہوتی ہیں۔ سیالکوٹ کی جس مسجد میں حقیقت رائے پڑھا کرتا تھا۔ وہ مسجد اب تک محلہ ہیجڑاں میں موجود و آباد ہے۔

حقیقت رائے کے متعلق ہندو شاعروں نے بہت سی دردناک قصے لکھے ہیں۔ اور اس کے ایثار کی تعریف کر کے اُسکو حقیقت رائے دھرمی کا خطاب دیا ہے۔

## محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ اور سیالکوٹ

### ۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۸ء

محمد شاہ روشن اختر کی حکومت کو نادر شاہی آفت گئے بعد جس دوسری مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کا (۱۷۴۷ء کا) حملہ تھا جسمیں گو احمد شاہ

ابدالی کو اس کے ہمنام شہزادہ احمد شاہ تیموری بن محمد شاہ نے بمقام سرہند کامل شکست دی۔ مگر ابدالی کے کابل اور تیموری کے دہلی واپس جانے کے بعد سکھوں کے دل سے مغلیہ حکومت کا رہا سہا رعب بھی جاتا رہا۔ اور وہ پھر جنگلوں سے نکل کر لاہور اور سیالکوٹ پر حملے کرنے لگے۔ اس زمانہ میں وزیر قمر الدین خان کا بیٹا نواب معین الملک لاہور کا حاکم تھا۔ اور سیالکوٹ بھی اسی کے ماتحت تھا۔

جس طرح آجکل سرحدی لوگ بنوں۔ کوہاٹ۔ تھل وغیرہ سرحدی مقامات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جبراً پکڑ کر لیجاتے ہیں۔ اور پھر ان کے وارثوں سے زر فدیہ طلب کر کے ان کو واپس کرتے ہیں۔ یا کئی کئی وحشی خونخوار سرحدی پٹھان جمع ہو کر کسی سرحدی گاؤں میں دفعتہً چھاپہ مارتے اور گاؤں کے گاؤں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اسی طرح اُس زمانہ میں خونخوار سکھ ڈاکے اور چھاپے مارتے اور خلق خدا کو بیحد تکلیف دیتے تھے۔ سیالکوٹ کے لوگ شام ہی سے دروازہ بند کر لیتے تھے۔ اور شہر کے دروازے بھی سر شام ہی ماسوائے محلہ موری دروازہ کے جو تمام رات کھلا رہتا تھا (موری دروازے کا حاکم شہر کا حاکم ہوتا تھا) بند ہو جاتے تھے۔ مگر پھر بھی کئی اِکے ڈکے سکھوں کے قابو آجاتے تھے۔

## احمد شاہ اور سیالکوٹ

### ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء

محمد شاہ رنگیلے کے بیٹے احمد شاہ کی سلطنت اور معین الملک کی نظامت لاہور کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی پھر ایک مرتبہ خونخوار لشکر لے کر کابل سے نکلا۔ جب احمد شاہ دریائے اٹک کو عبور کر چکا۔ تو اُس نے بادشاہ کو دہلی لکھا۔ اور مدد طلب کی۔ لیکن وہاں صدائے برنخاست کا معاملہ تھا۔ آخر جب ابدالی لشکر لاہور کے کنارہ آپہنچا۔ تو معین الملک نے کوئی چارہ نہ دیکھکر صلح کے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ آخر صلح اس شرط پر ہوئی کہ گورنر لاہور۔ سیالکوٹ۔ گجرات۔ پسرور وغیرہ پرگنوں کی آمدنی ہر سال کابل پہنچایا کرے۔ معین الملک نے یہ شرط منظور کر کے

ابدالی سے اپنی جان توچھڑالی۔ مگر ۱۷۵۲ء سے سیالکوٹ کی آمدنی صوبہ لاہور کی معرفت کابل جانے لگی +

## احمد شاہ کابلی کے ماتحت سیالکوٹ کی حالت

سیالکوٹ جو ۱۵۲۵ء سے تیموری خاندان کے ماتحت چلا آتا تھا ۱۷۵۲ء میں یعنے کامل دوسو ستائیس سال کے بعد کابل کے دُرانی خاندان میں انتظاماً نہ سہی لیکن مالی طور پر ضرور منتقل ہوگیا۔

شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا کہ سِکھ اور مرہٹے پنجاب کو پامال کرنیکے لئے ایک دوسرے پر سبقت لیجارہے تھے۔ اسی اثناء میں احمد شاہ ابدالی پھر پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ اور اس مرتبہ وہ ایک اپنا گورنر خواجہ عبید خاں لاہور میں مقرر کر گیا۔ کابل جاکر اس نے عبید خاں کے پاس سات ہزار افغانوں کی ایک جمعیت بسر کردگی سردار نورالدین خاں سکھوں کے استیصال کے لئے روانہ کی۔

ابھی نورالدین گوجرانوالہ ہی میں تھا کہ ۱۷۶۳ء مطابق ۱۸۲۰ بکرمی میں چڑت سنگھ[۱] سکرچکیہ وغیرہ سرداروں نے معہ جسا سنگھ اہلو والیہ[۲] اُسکا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بہت سے کشت وخون کے بعد نورالدین خاں کو شکست ہوئی اور وہ میدان سے بھاگ کر سیالکوٹ کے قلعہ میں کہ نہایت مستحکم و مضبوط تھا۔ پناہ گزین ہوگیا۔ سکھوں نے قلعہ کا محاصرہ کرکے رسد چاروں طرف سے بند کردی۔ اہل شہر پر یہ دن بڑی مصیبت کے تھے۔ ان پر اکثر حملے ہوتے تھے۔ اور وہ کو ٹ مار لئے جاتے تھے۔ کئی دنوں کے بعد جب اہل قلعہ کی رسد ختم ہوگئی۔ تو نورالدین خاں موقع پاکر جموں کے راجہ کے پاس چلا گیا۔ جو اس سے بڑی عزت کیساتھ پیش آیا۔ خواجہ عبید خاں گورنر لاہور نے یہ غلطی کی کہ سکھوں پر اعتبار کرکے اُن کو فوج میں بھرتی کر لیا۔ اور ایک فوج لیکر جسمیں سکھوں کی بھی معقول تعداد تھی۔

---

[۱] - دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ + [۲] بانئے ریاست کپور تھلہ +

نورالدین خاں کی مدد کیلئے سیالکوٹ روانہ ہوا۔ ابھی گوجرانوالہ تک ہی پہنچا تھا کہ سکھوں کی فوج جو سیالکوٹ پر ظفریاب ہوکر لاہور پر حملہ آور ہونے کیلئے واپس آرہی تھی۔ عبید خاں کو ملی۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ ابھی لڑائی شروع ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ کہ اُسکی فوج کی کثیر تعداد بوجہ ہم مذہبی سکھوں سے جاملی۔ اور عبید خاں کو ان بدعہدوں کی دغابازی سے شکست کھانی پڑی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب پر شاہان دہلی کا کوئی اثر نہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے عُبید خاں کی جگہ دیوان کابلی مل کو جو پہلے نائب گورنر تھا۔ لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ کابلی مل کے زمانہ میں سکھوں کا پھر زور ہو گیا۔ اور ان کے مجبور کرنے بلکہ انکی علانیہ دھمکیوں سے خوف کھاکر دیوان نے قصابان گاؤکُش کے ناک کان کاٹ دیئے۔ احمد شاہ نے دیوان کی یہ بُزدلی سُن کر کابل سے دلاور خاں نام ایک افغان کو لاہور کا صوبہ دار بناکر بھیجا۔ اور کابلی مل کو اس کا نائب مقرر کیا۔ کابلی مل نے بظاہر تو کوئی چون چرا نہ کی۔ مگر دل میں بہت بُرا منایا۔ اور اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ سکھوں سے مل کر اُن کو صلاح دی کہ بادشاہ کے مقرب و مصاحب جہان خان پر حملہ کرو۔ جو تمہارے تباہ کرنے کی فکر میں دس ہزار سوار لئے قلعہ رہتاس میں موجود ہے۔ جب سکھ دیوان کا اشارہ پاکر جہان خاں پر حملہ آور ہوئے تو وہ سیالکوٹ میں مقیم تھا۔ سکھ بھی سیالکوٹ پہنچے۔ صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ اہل شہر توپوں کی گرج اور تلواروں کی چمک سے لرزاں[1] و ترساں رہے۔ جہان خاں شکست کھاکر رہتاس بھاگ گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۴ء کا[2] ہے۔ اس زمانہ میں

---

۱ تاریخ پنجاب صفحہ ۸۴۔ مصنفہ رائے بہادر کنہیا لعل لاہور۔

۲ اسی واقعہ کے متعلق تاریخ کپورتھلہ میں صفحہ ۲۰۹ پر مندرجہ ذیل سطور درج ہیں۔ سمت ۱۸۲۱ مطابق ۱۷۶۴ء میں سرداران مثل بھنگی (سانون سنگھ۔ گنڈا سنگھ۔ جھنڈا سنگھ۔ ہری سنگھ اہلووالیہ۔ ناہر سنگھ چاری والہ) و سرداران مثل گھنیاں (جے سنگھ۔ حقیقت سنگھ۔ امر سنگھ گھنیا امیر سنگھ کنگرہ) ۲۵ ہزار سکھوں کی جمعیت لیکر مہاراجہ جسا سنگھ کپورتھلیہ کیساتھ (آگے دیکھو صفحہ ۱۱۹

سیالکوٹ کی حکومت جیون خاں پٹھان کے سپرد تھی۔

سکھوں کے جن سرداروں نے سیالکوٹ پر حملہ کر کے جہان خاں کو شکست دی۔ اور جیون خاں کو حکومت سے بے دخل کیا تھا۔ اُن کے نام حسب ذیل ہیں:۔ ہری سنگھ۔ ساون سنگھ۔ گنڈا سنگھ۔ جھنڈا سنگھ۔ ان سب سرداروں کا تعلق سکھوں کی بھنگی مثل سے تھا۔[۱]

ان سب سرداروں نے بالاتفاق سردار جیت سنگھ کو سیالکوٹ کا حاکم مقرر کیا۔

## رنجیت سنگھ کی فوجکشی سیالکوٹ پر

### سنہ ۱۸۰۷ء

رنجیت سنگھ شاہ زمان کی خوشنودیٔ مزاج اور رعایائے لاہور کے ایماء کی بعد[۲] جب سنہ ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قابض ہو گیا۔ تو چند ہی دنوں میں اُس نے جسروٹہ۔ جمبہ

(بقایا از صفحہ ۱۱۸) سیالکوٹ پر حملہ آور ہوئے۔ موضع مسکن پنڈ میں جو سیالکوٹ سے بفاصلہ پانچ کوس دُور ہے سردار جہان خاں اپنی فوج لئے مقیم تھا۔ بہت سے کشت و خون کے بعد جہان خاں ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کہیں غائب ہو گیا۔ مہاراجہ جیتا سنگھ نے سردار کے قبائل کو اُنکی مرضی کے مطابق جموں بھجوا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار کی بیگم اور جموں کی رانی کا آپس میں بہناپا تھا۔ (حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] تاریخ بندوبست سیالکوٹ صفحہ ۳۱ ✤

[۲]۔ جب سنہ ۱۷۹۸ء میں کابل کو واپس جاتے ہوئے شاہ زمان والئے کابل کی چند توپیں دریائے چناب سے پار نہ ہو سکیں تو اس نے رنجیت سنگھ کو جو ان دنوں رسولنگر کا مالک و مختار تھا۔ اور جسکی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی یہ حکم دیا تھا کہ اگر تم ہماری توپیں دریا سے نکلوا کر ہمارے پاس کابل میں پہنچا دو گے تو حکومت لاہور کی سند تمہارے نام کر دی جائے گی۔ بقول حافظ شیرازیؒ ؎ اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا ✤ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را ✤ رنجیت سنگھ نے توپیں نکلوا کر شاہ زمان کے بھیجدیں۔ اور حکومت لاہور گھر بیٹھے لے لی جو حکومت پنجاب کا پیش خیمہ تھی۔ رعایائے لاہور بھی سہ حاکمان لاہور کے ظلم و ستم سے تنگ تھی۔ اُس نے بھی اپنے قائم مقاموں کے ذریعہ رنجیت سنگھ کو لاہور پر حملہ کرنیکی دعوت دی ✤

کے علاوہ کئی اَور رؤساء اور راجے مطیع کر لئے۔ مگر ابھی تک دو سرداروں کی طرف سے کھٹکا تھا۔ ایک جیون سنگھ سردار بھنگی جو جیت سنگھ کے بعد سیالکوٹ پر حکمران تھا۔ دوسرے صاحب سنگھ بھنگی جس کی حکومت دریائے چناب سے پار گجرات کے علاقہ میں تھی۔

رنجیت سنگھ نے پہلے جیون سنگھ کی موت کا انتظام سوچا۔ ایک جرار فوج لیکر جب سیالکوٹ کے نزدیک پہنچا تو اپنے وکیل کے ہاتھ اُسے یہ پیغام بھیجا کہ اگر مال وجان کی سلامتی مطلوب ہے۔ تو اطاعت نامہ لکھدو۔ اور سالانہ نذرانہ مقرر کردو۔ ورنہ جنگ کے بعد کوئی عذر سماعت نہو گا۔ جیون سنگھ کو سامانِ جنگ اور قلعہ کے استحکام پر تکبر اور گھمنڈ تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کے عروج واقبال سے غافل تھا۔ اُس کے وکیل کو جواب دیا ع ہمیں میدان ہمیں چوگاں ہمیں گو!

رنجیت سنگھ کو جب یہ جواب ملا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے فوراً شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور قلعہ کی بیرونی آبادی پر اس قدر سختی کی کہ روپیہ پیسہ تو کجا۔ اُنکا کپڑا اور زیور تک بھی نہ چھوڑا۔ ہندو مسلمان کوئی بھی رنجیت سنگھ کے اِس ظلم سے نہ بچ سکا۔ سکھ وحشیوں کی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے۔ اور گھر کا اسباب تہ وبالا کر کے اور گھر والوں کو مار پیٹ کر جو کچھ ملتا تھا لے آتے تھے۔

جیون سنگھ نے قلعہ کا یہ انتظام کیا کہ ایک ہزار مسلح سکھ قلعہ کی دیواروں پر بٹھا دیئے جو رنجیت سنگھ کے آدمیوں کی خبر رکھتے۔ اور دُور ہی سے ان کو تاک کر نشانہ لگاتے تھے۔ چار توپیں اُس کے پاس تھیں۔ وہ اس نے قلعہ کی چاروں دیواروں پر نصب کرادیں۔ شہر والوں کو قلعہ والوں کی خبر نہ تھی۔ اور قلعہ والے شہر والوں کے حال سے بے خبر تھے۔

جیون سنگھ کی فوج ایکدو مرتبہ قلعہ سے باہر نکلی مگر بہت سا نقصان اُٹھا کر واپس آگئی۔ اس وقت اہل شہر کی جو حالت تھی۔ اسکی کچھ کیفیت ذیل کے الفاظ سے معلوم ہو سکے گی، "سکھوں نے شہر کی خوب خبر لی۔ اور ایسا لُوٹا کہ نان شبینہ

کا محتاج کر دیا۔ بعد ازاں مکامل تین دن تک قلعہ کا محاصرہ رہا۔ اہل قلعہ نے مہاراجہ کی فوج کے بیشمار گھوڑے تلف کئے۔ اور کئی آدمی بھی جان سے مار دیئے۔ چوتھے دن مہاراجہ نے یہ تجویز کی کہ دو توپیں قلعہ کے دروازہ پر نصب کر کے دروازہ کو توڑ دیا جائے مگر اہل قلعہ بھی ایسے جوانمرد تھے کہ اندر سے پے درپے گولے برساتے تھے۔ اور توپوں کو دروازہ تک نہیں آنے دیتے تھے۔

رنجیت سنگھ نے حکم دیا کہ گھوڑوں اور بیلوں کی جگہ توپوں کے آگے سکھوں کو جوتا جائے۔ چنانچہ ایک ایک توپ آگے سینکڑوں سکھ حیوانوں کی طرح لگائے گئے۔ جو مرتے کٹتے قلعہ کے دروازہ تک توپیں لے ہی گئے۔ توپوں کا وہاں پہنچنا ہی تھا کہ گولہ باری شروع ہو گئی۔ رنجیت سنگھ قلعہ کا دروازہ توڑنے میں آخر کامیاب ہو گیا۔

جیون سنگھ قلعہ کے اندر محصور تھا۔ وہ بچکر کہاں جا سکتا تھا۔ اس کی گرفتاری فوراً عمل میں آئی۔ اس کا خزانہ اور اسلحہ کا ذخیرہ اور بارود کا سامان سب ضبطی میں آ گئے۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے شہر میں منادی کرا دی کہ لوگ بے اندیشہ گھروں میں آباد اور اپنے اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ لیکن اتنی لوٹ مار اور اسقدر تباہی و بربادی کے بعد لوگ زبان حال سے یہ کہتے تھے ع اب کیا رہا ہے جسے رقیبوں کا ڈر کریں۔

غرض ۱۸۰۷ء میں سنگھان بھنگی کی حکومت کا سیالکوٹ میں خاتمہ ہوا۔ رنجیت سنگھ نے سیالکوٹ کی کارداری حکما سنگھ چمنی کے سپرد کی۔

## رنجیت سنگھ کا جشن سیالکوٹ میں

سیالکوٹ کے بعد گجرات اور گجرات کے بعد کئی اور شہر رنجیت سنگھ کے قبضے میں آتے گئے۔ اٹک کا قلعہ کہ قبضہ پشاور کی کنجی تھی۔ وہ بھی انہی ایام میں فتح ہو گیا۔ رنجیت سنگھ آپ تو ان فتوحات کے شکرانہ و نذرانہ کیلئے جوالا مکھی روانہ

ف۔ تاریخ پنجاب۔ رائے بہادر کنھیا لعل صفحہ ۱۹۳۔

ہوا۔ اور کھڑک سنگھ اپنے ولی عہد کو حکم دیا کہ وہ فوج سمیت سیالکوٹ جائے اور ہمارے آنے کا منتظر رہے۔ کھڑک سنگھ لاؤ لشکر سمیت سیالکوٹ آگیا۔ شہر میں چاروں طرف سکھ ہی سکھ نظر آتے تھے۔ ہر چند رنجیت سنگھ نے امن و امان کی منادی کرادی تھی مگر لوگ ان کو دیکھ کر خود بخود سہمے جاتے تھے۔ جب رنجیت سنگھ جوالا مکھی کے مندر سے واپس سیالکوٹ آیا تو اس نے آتے ہی تمام راجگانِ کوہستانی اور جاگیرداران ملک کے نام احکام صادر کئے۔ کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لیکر فی الفور سیالکوٹ میں حاضر ہوں۔ رنجیت سنگھ کا رعب داب اس وقت تمام پنجاب پر چھایا ہوا تھا۔ کسی کو سرتابی کی طاقت نہ تھی۔ سب راجے۔ رئیس۔ جاگیردار حاضر ہوگئے۔ سیالکوٹ فوجوں کی کثرت سے اچھا خاصہ میدانِ جنگ معلوم ہوتا تھا۔ کئی دنوں تک جشن ہوتے رہے۔ اور عیش و نشاط کا بازار گرم رہا۔ رنجیت سنگھ کا اس اجتماع عظیم سے مطلب صرف یہ تھا۔ کہ لوگوں پر اسکی ہیبت چھا جائے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد سب راجے اور رئیس رخصت کردیئے گئے اور رنجیت سنگھ بھی اپنی فوجیں لیکر اور توپخانہ اونٹوں پر لدوا کر سیالکوٹ سے وزیر آباد اور وہاں سے رہتاس کیطرف روانہ ہوگیا۔

## شاہ شجاع والئے کابل سیالکوٹ میں

شاہ شجاع جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا اور اسی شاہ زمان کا بھائی تھا جس نے چند توپوں کے معاوضہ میں رنجیت سنگھ کو پنجاب کا فرمانروا بنا دیا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں تختِ کابل پر بیٹھا۔ ۱۸۱۲ء میں اسکی قسمت نے پلٹا کھایا۔ وہ اس توقع پر رنجیت سنگھ کے پاس چلا آیا کہ آخر ہمارے خاندان کا احسان مند ہے خاطرداری سے پیش آئیگا۔ اور اگر احسان بھی اسکو یاد نہ ہو تو آخر پنجاب کا بادشاہ ہے۔ وہی سلوک مجھسے کریگا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔

رنجیت سنگھ نے چند دنوں تک تو خاطرداری کی۔ لاہور کی مشہور مبارک حویلی[1]

---

[1] - اسی مبارک حویلی میں نواب سر فتح علیخاں قزلباش رئیس و جاگیردار لاہور کا قیام تھا۔ یہ حویلی موچی دروازہ کے اندر متصل چوک نواب صاحب واقع ہے۔

شاہ شجاع کی اقامت گاہ بنی۔ جب رنجیت سنگھ کو معلوم ہوا۔ کہ کوہ نور ہیرا شاہ کے پاس ہے تو اُس نے اس کے لینے کیلئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ اپنے وزراء امراء اس کے پاس بھیجے۔ وہ بھی ناکام آئے۔ تو تین دن تک اناج کا ایک دانہ بھی اندر جانے کی ممانعت کر دی اور سخت پہرے لگا دیئے۔ جب بادشاہ اور اُسکی بیگمات بھوک سے ہلاک ہونے لگے۔ تو اس شرط پر کوہ نور دیا جانا منظور ہوا کہ رنجیت سنگھ خود بادشاہ کے پاس آئے۔ اور ہیرا طلب کرے۔ رنجیت سنگھ نے ایسا ہی کیا۔ اور ہیرا لے لیا۔ یہ واقعہ یکم جون ۱۸۱۳ء کا ہے۔ شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ رنجیت سنگھ بادشاہ نہیں بلکہ ایک ڈاکو اور حریص اور رہزن ہے۔ تو مزید بے عزتی کے خوف سے رات ہی رات حویلی سے نکل کر ایک چھکڑے کے ذریعہ گوجرانوالہ پہنچا۔ اور وہاں سے سیالکوٹ چلا آیا۔

ہر چند بھیس بدلے ہوئے تھا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے مخبر ہر جگہ تھے۔ اور سیالکوٹ تو خود رنجیت سنگھ کی مملکت میں تھا۔ اور شاہ شجاع کے فرار ہونے کی خبریں بھی تمام ملک میں پھیل چکی تھیں۔ اس لئے چند دن تو اُس نے بُری بھلی طرح یہاں بسر کئے۔ لیکن جب اطمینان کی کوئی صورت نہ دیکھی تو سیالکوٹ سے جموں اور وہاں سے کشتواڑ چلا گیا۔

## سیالکوٹ شہزادہ کشمیرا سنگھ و پشورا سنگھ کی جاگیر میں

رنجیت سنگھ نے سیالکوٹ کا پرگنہ اپنے دو بیٹوں کشمیرا سنگھ و پشورا سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تھا۔ دونوں بھائی ایک ہی ماں کے بطن سے تھے۔ اور اتفاق و محبت سے سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ جب ۱۸۴۲ء میں (رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد) زمانہ مہاراجہ دلیپ سنگھ راجہ ہیرا سنگھ وزیر ہو گیا۔ تو اس کے چچا راجہ سوچیت سنگھ کو یہ امر سخت ناگوار گزرا۔ کیونکہ وزارت کا وہ خود مدعی تھا۔ سوچیت سنگھ ڈوگرہ نے اپنے بھتیجے راجہ ہیرا سنگھ کی وزارت کو ناکام و بدنام کرنے کے لئے ملک

فتح خاں ٹوانہ سے ملکر ڈیرہ اسمعیلخاں۔ ملتان اور سیالکوٹ میں شورش پیدا کرادی بلکہ کنور کشمیرا سنگھ و پشورا سنگھ کو سلطنت و حکومت کی امیدیں بھی دلائیں۔

سیالکوٹ میں بے شمار نئے لوگ بھرتی ہو گئے۔ سکھوں کی چار رجمنٹیں لاہور سے پشاور کو جارہی تھیں۔ جب وزیر آباد پہنچیں اور انکو معلوم ہوا کہ کنور کشمیرا سنگھ جو تنخواہ اپنی نئی فوج کو دے رہا ہے وہ دربار لاہور کی تنخواہوں سے زیادہ ہے۔ تو چاروں رجمنٹیں اضافہ تنخواہ کے طمع پر پشاور جانے کی بجائے سیالکوٹ چلی گئیں۔

یہ حال دیکھکر دربار لاہور کو فکر دامنگیر ہوئی۔ راجہ گلاب سنگھ ان دنوں اپنی ریاست (جموں) میں تھا۔ دربار لاہور کے حکم سے وہ مفسدوں کی سرکوبی کیلئے لشکر اور خزانہ لیکر سیالکوٹ آیا۔ ایک دو معمولی لڑائیوں کے بعد مفسد منتشر ہو گئے۔ اور کشمیرا سنگھ و پشورا سنگھ کو اسلئے کچھ نہ کہا۔ کہ مہاراجہ کے فرزند ہونے کی وجہ سے سکھ اُن کا بڑا ادب کیا کرتے تھے۔

کشمیرا سنگھ تو چند دنوں کے بعد اُس لڑائی میں مارا گیا۔ جو اُس نے عطر سنگھ سندھانوالیہ اور بھائی بیر سنگھ (آنروئے ستلج) کے ساتھ شامل ہو کر راجہ ہیرا سنگھ کی فوج کے ساتھ کی تھی۔ باقی پشورا سنگھ رہ گیا۔ جواہر سنگھ برادر رانی جنداں اس سے بہت جلتا تھا۔ اس کے ایماء سے دربار لاہور نے اُسے جواب طلبی کیلئے لاہور بُلوایا۔ لیکن ساتھ ہی فوج خالصہ کی طرف سے یہ پیغام بھی پشورا سنگھ کو ملا۔ کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ جب پشورا سنگھ لاہور آیا۔ تو فوج نے دھوم دھام سے اس کا استقبال کیا۔ سرداران فوج نے بڈھو کے آوا پر اس کو مہاراجہ پنجاب تسلیم کر لیا۔ یہ حال دیکھ کر رانی جنداں اور اس کا بھائی جواہر سنگھ بہت گھبرائے۔ فوج کو قابو میں رکھنے کا صرف ایک ہی علاج تھا۔ کہ روپیہ بیدریغ خرچ کیا جائے۔ راجہ جواہر سنگھ نے فوج کے ہر سپاہی کو ۲۵- ۲۵- روپئے کا طلائی کنٹھہ دینے کا وعدہ کیا۔ فوج بندۂ زر تھی۔ پشورا سنگھ کو چھوڑ کر

جواہر سنگھ کے ساتھ ہو گئی۔ پشور اسنگھ اپنا سامنہ لیکر سیالکوٹ چلا آیا۔ اور وہاں سے اٹک جاکر قلعہ اٹک پر قبضہ کر کے امیر دوست محمد خاں والئے کابل سے خط و کتابت کرنے لگا۔ جواہر سنگھ نے پشور اسنگھ کے استیصال کیلئے فوج عظیم روانہ کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر جیتر سنگھ اٹاری والہ اور فتح خاں ٹوانہ نے کہ دونوں دربار لاہور کی فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ مکر و فریب کا جال پھیلا کر صلح کے بہانے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور واپسی کیوقت راجہ جواہر سنگھ کے ایماء کے مطابق ایک رات کو اسے قتل کر دیا۔ اور لاش اسکی دریائے اٹک میں پھینک دی! یہ واقعہ اواخر ۱۸۴۵ء کا ہے۔

## غدر ۱۸۵۷ء کا سیالکوٹ

سکھ افواج کی خودسری و جہالت اور وزراء و امرائے دربار کی خود غرضیوں اور خانہ جنگیوں نے بہت جلد سکھ حکومت کا پنجاب سے خاتمہ کر دیا۔ اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب مستقل طور پر برٹش گورنمنٹ کے ماتحت آگیا۔

لوگ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ رعایا شاد و آباد تھی۔ کہ دفعتہً ہندوستان میں غدر نمودار ہو گیا۔ غدر و شورش کا زیادہ زور یو۔پی اور دہلی و میرٹھ کی طرف تھا۔ پنجاب نسبتاً اس کے اثر سے بہت کچھ بچا۔ مگر پھر بھی کئی مقامات پر کم و بیش فساد اور خون ہوتے رہے۔ سیالکوٹ میں بھی ہندوستانی افواج نے ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو بغاوت کی۔ اسوقت مونگٹن صاحب ڈپٹی کمشنر میکمان اسسٹنٹ کمشنر اور جون صاحب اور سید قائم علی اکسٹرا اسسٹنٹان ضلع کے افسر تھے۔ انگریز چھاؤنی میں رہتے تھے۔ ہندوستانی سواروں نے بریگیڈیر افسر کے علاوہ کئی اور انگریز اور میم اور بچے قتل کر دیئے۔ کچھ راجہ تیجا سنگھ کی قلعہ نما حویلی میں جا چھپے۔ بعض بھاگ کر قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر مونگٹن بچارا بیمار تھا۔ وہ خدا جانے کن مشکلوں سے قریب کے ایک گاؤں

کی خس پوش جھونپڑی میں جا چھپا۔ غرض امن پسند طبقہ کی خیر خواہی کی بدولت اکثر انگریزوں کی جانیں تو بچ گئیں۔ مگر مفسدوں نے جیل خانہ کے سب قیدی رہا کرا دیئے۔ خزانہ لوٹ لیا۔ ضلع کا دفتر اور دوسرے تمام محکمے اور کچہریاں اور میگزین وغیرہ آگ لگا کر اُڑا دیئے گئے۔ پولیس کے پیادہ اور سواروں نے امن قائم رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ لفٹنٹ منٹگمری اس وقت رسالہ نمبر ۹ میں تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور پہنچے اور وہاں سے مدد لائے۔

جب کچھ امن ہوا۔ اور تحقیقاتیں شروع ہوئیں تو سیالکوٹ کے دو بڑے ہندوستانی افسروں کو سُولی پر چڑھایا گیا۔ بڑے بڑے مفسد گرفتار ہو کر قابل دار قرار پائے۔ ۱۳۹ مفسد جموں کی سرحد سے پکڑے آئے۔ وہ توپ سے اُڑا دیئے گئے غرض انتظام جدید میں کپتان کرب ڈپٹی کمشنر اور لارنس صاحب افسر پولیس مقرر ہوئے۔ اور از سرِ نو امن و امان قائم ہوا۔ اِس مفسدہ کی وجہ سے شہر باشوں پر پچاس ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ مگر جب حکام کو معلوم ہوا کہ شہر والے خیر خواہ رہے ہیں اور ان کی مدد و سعی سے اکثر انگریزوں کی جانیں بچی ہیں تو جرمانہ معاف کر دیا گیا۔ اسی جرمانہ کی رقم سے مولوی عبد الحکیم کے تالاب کی صفائی اور مرمت کی گئی۔

عبد الحکیم

# کتب صنعت وحرفت

ذخیرۂ صنعت وحرفت
- حصۂ اول عہ
- حصۂ دوم عہ/
- حصۂ سوم عہ/
- حصۂ چہارم عہ/
- حصۂ پنجم عہ/
- حصۂ ششم عہ/
- حصۂ ہفتم ۱۲/
- حصۂ ہشتم ۸/
- کل قیمت آٹھ حصوں کی پہلے ۱۲/
- موم بتی بنانا ۴/
- بسکٹ کا کارخانہ ۴/
- خیر ادکی حقیقت عہ/
- آئینۂ جواہرات صہ/
- بھوجن پرکاش ۸/
- رسالہ فوٹوگرافی ۸/
- چینی مٹی اور اس کے مصنوعات بنانے کی ترکیبیں ۸/
- لوہا ڈھالنا ۴/
- مکمل گھڑی سازی عہ/
- آلۂ مقناطیس ۴/
- گھر کا درزی ۴/
- ہدایت نامۂ باورچیاں عہ
- بن سوٹیاں بنانا ۴/
- دیا سلائی ۱۰/
- پارچہ بافی ۶/
- مٹی کے برتنوں پر کانچ چڑھانے کی ترکیبیں ۶/

- چھریاں چاقو ۴/
- صابون سازی عہ/
- رنگائی چھپائی ۸/
- روشنائی بنانا ۸/
- آتشبازی ۱۲/
- سیمنٹ ۸/
- جلا وآبداری ۸/
- ہر قسم کے روغن و وارنش ۸/
- مصنوعی دہاتیں ۸/
- مکمل مرغی خانہ ۴/
- تربیت الدجاج ۸/
- کلید صنعت دو حصہ ۶/
- گنجینۂ جواہرات ۴/
- خوان یغما ۸/
- مربے حلوے اچار چٹنیاں وغیرہ ۴/
- کارخانہ ڈھلائی عہ/
- دباغت ۴/
- علاج المویشی ۶/
- بھیڑ بکری کی پرورش ۴/
- دنداں سازی عہ/
- وارنش پالش ۶/
- بازاری ادویات عہ
- اینلنگ عہ/
- گلٹ سازی ۱۰/
- داغ دھبے دور کرنا ۱۰/
- داستان برق ۱۲/

- سیم پھوند ۶/
- حیات الحیوانات عہ
- علاج اسپاں عہ
- حالات کینسری ۴/
- ہندوستان کے بڑے دستکار
- قیمت صرف ۱۲/
- معالجات الکلب ۶/

## مذاہب اسلام

- مذاہب اسلام صہ/
- آئینۂ اسلام عہ/
- دلیل الحیران عہ
- فیض الرحمان عہ
- ہفت سورہ مترجم ۸/
- مطالعات صحیحہ ۶/
- نصائح فاروقیہ ۸/

- شرح عقاید نسفی عہ
- زیور ایمان ۶/
- علم الکلام عہ
- پنج ابنائے اسلام ۸/
- روض الرلی ۸/
- روایات اسلام ۴/
- اسلام کی پہلی دوسری اور تیسری چوتھی عہ
- جنرل اگارفیلڈ ۶/
- حیات زیب النساء ۶/
- مصنفان اسلام ۳/

یہ تمام کتابیں پیسہ اخبار سے مل سکتی ہیں

# زراعت و باغبانی

- کتاب الاثمار — عہ/
- کیمیائے زراعت — عہ/
- ترکاریاں — عہ/
- زراعت کی پہلی کتاب — عہ/
- کاشت آلو — ۲ر
- پھلواڑی — عہ/
- میوہ جات — عہ/

# سفر نامے

- سفرنامہ بغداد — ؏ر
- ہدایت الحجاج — ۴ر
- رہنمائے کشمیر — ۴ر

# تذکرات و سوانح عمری

- حیات النعیم — ۸ر
- الفاروق — ۴ر
- حضرت علیؓ — ۱۲ر
- سلطان فاتح — ۵ر
- حالات سعدی — عہ/
- پیغمبر اسلام — ۸ر
- حضرت ابوبکر صدیقؓ — عہ/
- خالد بن ولید — ۴ر
- سلطان الشہدائے سند — ۴ر
- مسٹر اینڈریو کارنیگی — عہ/

# کامیاب دولتمند بنانیوالی کتابیں

- دنیا کار دشمن نرخ — ؏ر
- قوت الحیات — ۸ر
- رسالہ قرض — ۸ر
- آہنی ارادہ — ۴ر
- دم فرصت — ۷ر
- مطالعۂ النفس — ۳ر
- شاہراہ دولت — عہ/
- سبیل دولت — ۸ر
- طریق دولت — ۱۲ر
- توجہ کی یکسوئی — ۳ر
- عمدہ حافظہ کا راز — ۶ر
- مطالعۂ باطن — ۴ر

# حفظ صحت و طب

- مجربات حفظ صحت حصۂ اول — عہ/
- رہنمائی فن عطاری — ۱۰ر
- ذخیرۃ الاطباء — عہ/
- قوت سماعت — ۲ر
- لکنت اور اس کا علاج — ۶ر
- مادر زاد گونگوں اور بہروں کی تعلیم — ۳ر
- طب کیمیائی — ۸ر
- مگدر و موگریاں — عہ/
- فادزہر — عہ/
- جڑی بوٹیاں — عہ/
- حسن و صحت بڑھانے کے لاجواب نسخے — ۴ر
- جلد بدن کے علاج — ۴ر
- مفتاح التشخیص — ۳ر
- بچے — ۳ر
- ” دوم — عہ/
- ” سوم — عہ/
- ” چہارم — عہ/
- ” پنجم — عہ/
- ” ششم — عہ/
- ” ہفتم — عہ/
- ” ہشتم — عہ/
- کشتہ جات — عہ/
- خوبصورتی و تندرستی — ؏ر
- درازی عمر — ؏ر
- صحت الابدان — ۱۱ر
- قلب اور اس کا فعل — عہ
- حالات اعضائے رئیسہ — ۸ر
- سلطان علاؤالدین خلجی — ۶ر
- سلطان صاحب قرآن — ۴ر

یہ تمام کتابیں پیسہ اخبار سے مل سکتی ہیں